جاری کردہ

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مارچ ۱۹۹۵

مدیر: خرم مراد

ادارۂ ترجمان القرآن

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مدیر: خرم مراد

جلد ۱۲۱ | مارچ ۱۹۹۵ شوال ۱۴۱۵ | عدد ۳

فہرست مضامین

برائے ادارتی امور

منصورہ ملتان روڈ لاہور ۵۴۵۷۰ فون نمبر ۸-۷۵۷۰۱۴۴ فیکس (۰۴۲) ۷۵۷۴۷۱۹

برائے انتظامی امور

ماہنامہ ترجمان القرآن :- ۵-اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور -

فون نمبر سرکولیشن :- ۷۵۸۷۹۱۶ انتظامی امور :- ۷۵۸۵۵۹۰

زر سالانہ بذریعہ منی آرڈر یا بنک ڈرافٹ ترجمان القرآن لاہور کے پتہ پر ارسال فرمائیں -

کراس چیک قبول نہیں کیے جائیں گے -

قیمت فی شمارہ : /۱۲ روپے، زر سالانہ : /۱۲۰ روپے (اندرون ملک)

مشرق وسطی /۴۵۰ روپے - بنگلہ دیش /۳۰۰ روپے - یورپ / مشرق بعید ۶۰۰ روپے -

امریکہ / کینیڈا / آسٹریلیا ۷۰۰ روپے

سید حسین فاروق مودودی نے ملک عید پرنٹرز لاہور سے چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا -

ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ اچھرہ، لاہور (پاکستان)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

خرم مراد

۱۷ جنوری کا دن تھا۔ ابھی صبح کی روشنی نمودار ہونے میں تھوڑی ہی دیر تھی کہ اچانک (۵:۴۶ پر) زمین ہلی' ایک جھٹکا لگا' اور صرف ۲۰ سیکنڈ میں زلزلہ جاپان کے انتہائی ماڈرن' خوبصورت' اور آباد و خوش حال شہر کوبے میں کھنڈرات کے ڈھیر لگاتا ہوا نکل گیا۔ روشنی ہونے سے پہلے' آناً فاناً پورا شہر ہلاکت اور تباہی کے گہرے اور طویل اندھیروں میں ڈوب گیا: ۵ ہزار سے زائد آدمی پلک جھپکتے میں موت کی آغوش میں چلے گئے' ۵۰ ہزار سے زائد گھر اور بلند و بالا عمارتیں پتوں کی طرح بکھر گئیں' ٹیکنالوجی کی شہ کار سڑکیں ٹوٹ پھوٹ کر رہ گئیں' اور آہنی ریلوے لائنوں کو جیسے کسی نے توڑ مروڑ کر رکھ دیا۔

جاپان سے ہم مرعوب ہیں' اس کی معاشی ترقی نے ہماری نگاہوں کو چکاچوند کر رکھا ہے' ہم جاپان جیسا بننے کی آرزو میں سلگتے رہتے ہیں' (اگرچہ ہمیں ان اخلاقی صفات کا پتا نہ ہو' نہ جستجو' جنھوں نے جاپان کو "جاپان" بنایا ہے) لیکن وہ ہم سے بہت دُور واقع ہے' اور اس سے ہمارا ربط برائے نام ہے۔ کوئی تعجب کی بات نہیں اگر ہم اس قیامت کی تباہی پر ایک نگاہ غلط انداز ڈال کر گزر گئے' اور یہی سوچتے رہے کہ ہمیں اس سے' یا اس جیسے دوسرے حوادث سے' کیا سروکار۔

اجتماعی آفات و حوادث انسان کی زندگی کا ایک مستقل اور لازمی حصہ ہیں۔ یہ آفات سماوی ہوں' جیسے زلزلے' طوفان' سیلاب' سائیکلون' وبائیں اور قحط' یا انسان کی اپنے ہاتھوں لائی ہوئی' جیسے باہمی بغض و عداوت' جنگ و خون ریزی' ظلم و فساد اور دلوں کی قساوت۔ قرآن مجید نے یہ واضح کر دیا ہے کہ ان کا تعلق اجتماعی اخلاق و اعمال سے ہے۔ لیکن یہ ہمیشہ صرف عذاب کا کوڑا بن کر ہی نہیں آتیں' یہ خالقِ فطرت کے اسکول کی معلم بھی ہیں۔ سورۃ المرسلات میں ان ہواؤں کی طرف متوجہ کیا گیا ہے جن کو چھوڑ دیا جاتا ہے تو وہ تیز و تند ہو کر بستیوں کا نام و نشان مٹا دیتی ہیں' ریت کے پہاڑوں کو

بہا لے جاتی ہیں' پہاڑوں کی طرح موجیں اٹھا کر لاکھوں لوگوں کو چشم زدن میں غرقِ آب کر دیتی ہیں۔ پھر فرمایا گیا ہے ' فَالْمُلْقِيَاتِ ذِكْرًا، عُذْرًا، أَوْنُذْرًا، اس طرح یہ ہوائیں تذکیر و تعلیم کا سامان کرتی ہیں: غافلوں پر اتمام حجت کرتی ہیں' ان کو جگاتی ہیں' کان و دل رکھنے والوں کو ہوشیار اور آگاہ کرتی ہیں۔

جن کو فسیحوا فی الارض کی ہدایت کی گئی ہے 'تا کہ وہ مدرسۂ فطرت کے ان معلمین سے استفادہ کریں' ان کے سامنے اگر آج کا میڈیا ان معلمین کو گھر بیٹھے ان تک پہنچا دے تو وہ اپنا شمار ان لوگوں میں کیوں کرائیں جو "زمین و آسمان میں کتنی ہی نشانیاں ہیں جن پر سے گزرتے رہتے ہیں اور ذرا توجہ نہیں کرتے" (یوسف ۱۲:۱۰۵)۔

کوبے کا زلزلہ کوئی انوکھا یا غیر معمولی واقعہ نہیں تھا۔ زلزلے آتے ہی رہتے ہیں۔ اندازہ ہے کہ زمین کو ایک سال میں ایک لاکھ چھوٹے بڑے جھٹکے لگتے ہیں۔ گذشتہ ۲۵ سال ہی میں کوبے کے زلزلہ سے کہیں زیادہ تباہ کن زلزلے آئے ہیں: ۱۹۹۳ میں مہاراشٹر میں ۳۰ ہزار' ۱۹۹۰ میں ایران میں ۴۰ ہزار' ۱۹۸۸ میں آرمینیا میں ۵۵ ہزار' ۱۹۷۶ میں چین میں ۲ لاکھ ۴۲ ہزار اور ۱۹۷۰ میں پیرو میں ۶۷ ہزار آدمی زلزلوں میں ہلاک ہوئے۔

لیکن جس طرح کوبے کے زلزلہ کی تصاویر اور تفصیلات ساری دنیا کی' کم سے کم مغربی دنیا کی' نگاہوں کا مرکز بن گئیں' اس طرح کسی کی نہ بنیں' سوائے گذشتہ سال لاس اینجلز کے زلزلہ کے۔ یقیناً اس میں میڈیا کی روز افزوں قوت کو بڑا دخل ہے۔ لیکن میڈیا کی دلچسپی کی بھی اصل وجہ یہ ہے کہ یہ آفت ایک ماڈرن شہر میں آئی اور اس میں مرنے والے ترقی یافتہ اور مغربی انسان تھے' جبکہ دوسری آفتوں کا شکار پس ماندہ علاقے اور غیر ترقی یافتہ اور غیر مغربی لوگ تھے۔ اس رویہ کی تہ میں تصور یہ ہے کہ لاس اینجلز اور کوبے جیسے شہر اس سائنس و ٹیکنالوجی کی کارفرمائیوں اور کارناموں کا مظہر ہیں جس کے بارہ میں یہ ایمان ہے کہ وہ ہر چیز کی توجیہ کر سکتی ہے' ہر پیش آنے والے واقعہ کی خبر دے سکتی ہے' ہر مشکل میں کارگر اور ہر مسئلہ کا حل ہے' ہر کام کر سکتی ہے یا کر سکے گی' گویا فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ ہے۔ کوبے کے زلزلہ جیسے واقعات سائنس کی ان دیکھی 'لامتناہی قوت پر اس ایمان کو جڑوں سے ہلا دیتے ہیں اور اس کے تارو پود بکھیر دیتے ہیں۔ جو رب کے بجائے اسباب پر ایمان رکھتے ہیں' اسباب کی شکست و ریخت دیکھتے ہیں تو زیادہ ہی حیرت زدہ ہو جاتے ہیں' زیادہ ہی صدمہ سے دوچار ہوتے ہیں۔ مغرب کا انسان بھی مجبور ہو جاتا ہے کہ وہ رکے' ٹھہرے' نوٹس لے' سوچے اور اپنی بے بسی اور محتاجی کا اعتراف کر لے۔ خواہ چند لمحوں ہی کے لیے سہی۔ اور خواہ دماغ اسی کا قائل رہے کہ "اچھے اور برے دن تو

تاریخ میں ہمیشہ ہی آتے رہے ہیں" (الاعراف ۷: ۹۵)۔ ان کا کسی اَن دیکھی بالاتر قوت کے ارادہ' تدبیر' قدرت اور حکمت سے کیا تعلق۔ یہ اندھے طبیعی قوانین کا نتیجہ ہیں' ان سے گھبرا کر کسی ان دیکھی قوت کے آگے جھک جانا اور تضرع کرنے لگنا' نفسی کمزوری کی علامت ہے۔

کوبے کے زلزلہ کو قیامت کے زلزلہ (زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ) سے کیا نسبت' مگر ایک مغربی نامہ نگار کے الفاظ میں' تباہی کے مناظر "دوسری دنیا کے قیامت کے مناظر کی طرح عجیب و غریب اور خوف ناک و دہشت ناک تھے"۔ رات بھر لوگ نیند اور رنگ رلیوں میں پڑے رہے' مگر منہ اندھیرے چشم زدن میں صفایا ہو گیا۔ "رات کو وہ سوئے پڑے تھے کہ تمہارے رب کی طرف سے ایک بلا اس باغ پر پھر گئی' اور اس کا ایسا حال ہو گیا جیسے کٹی ہوئی فصل ہو" (القلم ۶۸: ۲۰)۔ گھوڑوں کا تخت و تاراج ہو' ہوائی بمباری اور میزائلوں کی بارش ہو' زلزلہ اور سائیکلون ہو' شبِ آخر ہی عموماً وقت مَوعِد ہوتا ہے۔ اور "صبح ہوتے اب دیر ہی کتنی ہے!" (ہود)۔ لیکن لوگ لمبی تانے پڑے رہتے ہیں' خوابِ غفلت میں مدہوش' گویا وہ گھڑی اب ان پر آئے گی ہی نہیں۔

دیوپیکر عمارتیں جدید ترین معیارات تحفظ کے مطابق بنائی گئی تھیں' لیکن ان کے تلے سے زمین سرک گئی' جو بستی' بکھری ریت (کَثِیْبًا مَّهِیْلًا) بن گئی' اور عمارتیں زمین بوس ہو گئیں۔ زمین خود ۶'۶ فٹ اونچے ریت کے فواروں کی صورت میں بہہ نکلی۔ جن عمارتوں کا کچومر زلزلہ کے جھٹکے نے نکالا وہ ایسی ہو گئیں جیسے "کاغذی گلاسوں (کَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ) کو توڑ مروڑ کر کوڑے کرکٹ کی طرح ڈال دیا گیا ہو"۔ زمین نے ابھی ہلنا بند نہ کیا تھا کہ ہر طرف آگ کے شعلے بھڑک اٹھے' گیس کے پائپ پھٹ گئے' اور آگ پھیلتی گئی۔

۲۰ سیکنڈ پہلے جن لاکھوں لوگوں کے پاس سازوسامان سے آراستہ و پیراستہ گھر تھے' اب وہ بے گھر تھے' سڑک پر پناہ کی تلاش میں سرگرداں تھے' پیٹھوں پر سامان لدا ہوا تھا' ہر طرف ملبہ بکھرا ہوا تھا' شعلے بھڑک رہے تھے' چاروں طرف پڑوسیوں اور چاہنے والوں کی لاشیں تھیں' جن کے پاس کھانے پینے اور پہننے کے لیے سب کچھ تھا' اب ان کو ایک وقت کا پیٹ بھر کھانا میسر نہ تھا۔ لازوال خوش حالی' سلامتی اور تحفظ کی دنیا بھسم ہو گئی۔ ۲۰ سیکنڈ میں وہ ایسے ہو گئے جیسے اس شہر میں کبھی رہے ہی نہ ہوں كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا۔

بظاہر شک کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ جاپان اس دنیاوی جنت کو دوبارہ تعمیر کرے گا۔ ۲ ہزار کروڑ روپے کے اخراجات کا تخمینہ ہے: اس کے پاس دولت کی کوئی کمی نہیں' ٹیکنالوجی اور وسائل و

ذرائع کی بھی نہیں ' اور حوصلوں اور عزائم کی تو فراوانی ہے ' جو سب سے بڑھ کر درکار ہوں گے ۔ لیکن صرف شہر اور انسان ہی نہیں ٹوٹے 'ٹیکنالوجی اور معیشت میں بے مثال ترقی کی ' اور عروج کی چوٹیوں پر پہنچ جانے کی ' جو ذہنی جنت دل و نگاہ نے بسالی تھی ' اس میں بھی زلزلہ آگیا ۔ ۲۰ سیکنڈ میں وہ بھی ایک سراب بن گئی ' وہ بھی ٹوٹ پھوٹ گئی ۔ کیا وہ بھی اتنی ہی آسانی سے بحال ہو جائے گی؟ دانش وروں کا خیال ہے کہ یہ زلزلہ جاپان کے لیے بیسویں صدی کا سب سے بڑا نفسیاتی حادثہ ہے ۔ اس ذہنی صدمہ سے ایک طویل عرصہ تک بحالی بہت مشکل ہے ۔ لیکن دانش ور یہ بھول جاتے ہیں کہ انسان خوش حالی حاصل ہوتے ہی سب کچھ بھول جاتا ہے ' سمجھتا ہے کہ سب کچھ اس کے علم اور زور بازو کا نتیجہ ہے ' مصیبت ایک اتفاقی حادثہ تھی ' جو آئی اور گزر گئی ۔

جاپان زلزلوں کی زد میں ہے ۔ ٹوکیو میں ہر سال ایک ہزار جھٹکے لگتے ہیں ' تقریباً ۷ سال میں ایک بڑا زلزلہ آجاتا ہے ۔ ۱۹۲۳ میں آخری آیا تھا ' جس میں ایک لاکھ ۴۳ ہزار آدمی ہلاک ہوئے تھے ۔ اس حساب سے اب کسی وقت بھی وہ "بڑا والا" (Big One) آسکتا ہے ۔ اس کی تیاری کے لیے ہر سال یکم ستمبر کو پورے شہر میں بچاؤ اور امداد کی ڈرل ہوتی ہے ۔ پیش بینی اور بچاؤ کی تیاریاں مکمل ہیں ملک کے طول و عرض میں زلزلہ پیما آلات لگے ہوئے ہیں ' زلزلوں کے ممکنہ خطوط کے نقشے بنے ہوئے ہیں ۔ لیکن کوبے میں تو زلزلہ کا بہت کم امکان تھا ۔ (لاس اینجلز میں بھی گذشتہ سال زلزلہ ایسے مقام پر آگیا ' جہاں نقشہ کے مطابق گمان بھی نہ تھا) ۔ پھر بھی ساری تیاریاں دھری رہ گئیں ۔ سائنس ' ٹیکنالوجی کی ساری ترقی اور دولت کے انبار کے باوجود کسی تدبیر نے کام نہیں کیا ۔ ۵۰ سال سے کوئی بڑا زلزلہ نہ آیا تھا ' لوگ مطمئن ہو گئے تھے کہ بس اب مَآ اَظُنُّ اَنْ تَبِيْدَ هٰذِهٖٓ اَبَدًا (ہم نہیں سمجھتے کہ یہ جنت کبھی بھی فنا ہو گی !) ۔ اچانک جھٹکا لگا : ترقی ' تحفظ ' اطمینان کے سارے خواب چکنا چور ہو گئے ۔

ہر زلزلہ سے سبق سیکھے جاتے ہیں کہ آئندہ زلزلہ کا مقابلہ کس طرح کیا جائے ۔ سب سے زیادہ دہشت اس بڑے زلزلے کی ہے جو ٹوکیو (یا سان فرانسسکو) جیسے شہر میں کسی وقت بھی متوقع ہے ۔ ایک نامہ نگار لکھتا ہے : "سب سے بڑا سبق تو یہ حاصل ہوتا ہے کہ کوئی سبق ایسا نہیں جو ایک بڑے شہر کو Big One سے تحفظ کی ضمانت دے سکے" ۔ لیکن ایسے سبق تو ہر زلزلہ دیتا ہے جن سے جو زلزلہ فی الواقع Big One (شئی عظیم) ہو گا ' اس سے تحفظ کا سامان ہو سکے ۔

اس حادثہ عظیمہ میں بھی جاپان نے اس کردار کا ثبوت دیا جس میں دراصل اس کی ترقی کا راز پوشیدہ ہے ۔ صبر اور خاموشی سے ہر مصیبت برداشت کر لی ۔ فوراً تعمیر نو کا کام شروع ہو گیا ۔ کوئی لوٹ مار نہیں ہوئی (جبکہ لاس اینجلز میں پہلے ہی دن پولیس نے ۵۰ وارداتیں پکڑی تھیں) ' لوگ سامان اس

طرح چھوڑ کر چلے گئے جیسے کوئی خطرہ ہی نہ ہو۔ کوئی ہڑبونگ نہ مچی۔ حکومت کی کارکردگی بڑی ناقص تھی 'مگر کوئی فساد نہ مچا۔ لوگوں نے چونک کر کہا: "ہم کو اپنی ترقی اور خوش حالی پر پھول نہیں جانا چاہیے 'ہم تو قرضہ کے وقت پر جی رہے ہیں"۔ یوکو ہاما کے میئر نے کہا: "یہ خطرہ کی آسمانی گھنٹی تھی"۔

جاپان ایک سرے پر ہے تو یورپ دوسرے سرے پر۔ ۳ جنوری اور ۲ فروری کے درمیان یورپ میں بپھرے ہوئے اور طغیانی پر اترے ہوئے دریاؤں نے ہالینڈ میں ڈھائی لاکھ لوگوں کو مال و اسباب سے بھرے 'پانی میں ڈوبے ہوئے گھروں سے پناہ گاہوں کی طرف نکل جانے پر مجبور کر دیا۔ اس سے پہلے جرمنی میں کولون اور بون جیسے شہر 'اور فرانس میں ۹۶ میں سے ۴۳ اضلاع زیر آب آ چکے تھے 'اور بالترتیب ۳۰ ہزار اور ۴۰ ہزار لوگوں کو گھر چھوڑنے پر مجبور ہونا پڑا تھا۔ ہلاک ہونے والوں کی تعداد تو ۶۰ ہی تھی 'لیکن بے گھر ہونے والوں کی تعداد کوبے کے برابر۔ ۳ لاکھ۔ پہنچ گئی۔

صدی کے بدترین سیلاب میں یورپ کا قلب ڈوب رہا تھا۔ جنوری کے دن برفانی دن ہوتے ہیں 'اور پہاڑوں پر برف کے انبار لگتے ہیں۔ اچانک 'ایک طرف مسلسل بارشیں شروع ہو گئیں اور زمین پر ندی نالے بہہ نکلے ' دوسری طرف وقت سے بہت پہلے درجہ حرارت اتنا بڑھ گیا کہ پہاڑوں پر برف پگھلنے لگی اور اوپر سے پانی کے دھارے اترنا شروع ہو گئے۔ سب سے بڑا دریا ' دریائے رائن ہے۔ انسان نے متوقع طغیانی سے تحفظ کی خاطر 'کانٹ چھانٹ کر اس کا راستہ مختصر کر کے اور دونوں طرف اونچے اونچے بند تعمیر کر کے 'اپنی دانست میں اسے اپنے قابو میں کر لیا تھا۔ لیکن پانی کی سطح اونچی ہوتی گئی ' اور جلد اس نے بند کی اونچائی کو جا لیا' شگاف پڑ گئے ' اور دریا کی طغیانی نے چاروں طرف فساد برپا کر دیا۔ غیر معمولی بارشیں تو 'کوبے کے زلزلہ کی طرح 'انسان کی کسی کارستانی کا نتیجہ نہیں 'مگر برف کے جلدی پگھلنے میں شاید اس کاربن کا دخل ہے جو جدید ٹیکنالوجی نے غیر معمولی مقدار میں فضا میں داخل کر دی ہے۔ اور دریا کی سطح میں روز افزوں بلندی یقیناً اس کے بہاؤ کے فطری راستہ میں مداخلت کا نتیجہ ہے۔ اب سوچا جا رہا ہے کہ دریا کو فطری راستہ پر واپس لے آیا جائے۔ افسوس ' تہذیب کے اس دھارے کے بارہ میں نہیں سوچا جا رہا کہ اسے بھی فطرت کے راستہ پر واپس لایا جائے 'جس کی طغیانی اور سرکشی نے انسان کی زندگی کو ظلم 'فساد اور خون سے بھر دیا ہے۔

---

۱۹ جنوری کو 'سات ہفتے کی مسلسل ہزیمتوں کے بعد روس جیسی عالمی طاقت بالآخر ننھے منے چیچنیا کے دارالسلطنت میں واقع صدارتی محل پر دو بم گرانے میں کامیاب ہو گئی ' اور یلسن نے نہ صرف

گروزنی پر قبضہ کی، بلکہ چیچنیا میں جنگ کے خاتمہ کی خوش خبری سنا دی۔ جنگ تو کیا ختم ہوتی، آج تک گروزنی پر مکمل قبضہ بھی نہیں ہوا۔ نہ کوبے کی طرح زلزلہ آیا اور نہ یورپ کی طرح سیلاب، مگر اس "عظیم الشان" فتح کے حصول کے لیے روس کے ہاتھوں (کوبے کے) ۵ ہزار سے کہیں زیادہ چیچن مسلمان شہادت سے سرفراز ہو چکے ہیں، ۳ لاکھ سے کہیں زائد لوگ بے گھر ہو چکے ہیں، گروزنی کا بیشتر حصہ روس کی وحشیانہ بمباری کے نتیجہ میں ملبہ کا ڈھیر بن چکا ہے۔ جنگ میں جو ہوا ہے سو ہوا ہے، روسیوں نے بے شمار بے گناہ شہریوں کو پکڑ پکڑ کر اور جنگی قیدیوں کو بلادریغ گولیوں سے اڑایا ہے، انھیں بدترین تعذیب کا نشانہ بنایا ہے، مار مار کر ان کے اعضا توڑے ہیں، لکڑیوں کی طرح ٹرکوں میں ٹھونس ٹھونس کر بھرا ہے اور ایک جگہ سے دوسری جگہ لے گئے ہیں۔

چیچنیا کی تباہی، جو کوبے اور یورپ کی تباہی سے بڑھ گئی، کسی آفت سماوی کا نتیجہ نہیں، یہ خود انسان کے اپنے ہاتھوں لائی ہوئی ہے۔ جب وہ خلافتِ ارضی کا مقام بھول گیا، شیطان کے پھندہ میں گرفتار ہو گیا، علم الاسما سے فلاح کے بجائے فساد بچانے کا کام شروع کر دیا، تو زمین فساد سے بھر گئی اور انسانی خون پانی کی طرح بہنے لگا۔ اَلَّذِیْنَ طَغَوْا فِی الْبِلَادِ فَاَکْثَرُوْا فِیْھَا الْفَسَادَ۔ توکیو کے متوقع زلزلے سے بچاؤ ممکن نہ ہو، مگر جو زلزلے انسان خود لاتا ہے ان سے بچاؤ ممکن ہے۔

چیچن مسلمانوں کے لیے یہ بھی راہ کھلی تھی کہ وہ اپنی جانوں، آبادیوں اور شہروں کو ہلاکت و تباہی سے بچا لیتے۔ مگر اس کے لیے انھیں روس کی غلامی قبول کرنا پڑتی۔ انھوں نے سوچ سمجھ کر آزاد رہنے کا، مسلمان کے طور پر آزاد رہنے کا فیصلہ کر لیا، اور اس کی خاطر جان و مال کی ہر قربانی پیش کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ قومیں دوسری قوموں پر بھی ظلم ڈھا سکتی ہیں، تفرقہ اور انتشار کا شکار ہو کر، ذلیل و پست مقاصد کے لیے اپنے اندر ہی عداوت و خون ریزی کی جہنم بھڑکا سکتی ہیں، لیکن جو اعلیٰ مقاصد کے لیے جینے کا عزم کر لیتی ہیں، ان کے لیے زندگی کی راہیں کھل جاتی ہیں، الا ماشاء اللہ، کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا۔

ہم سے بہت قریب، نگاہوں کے سامنے، اپنے گھر میں روز لاشیں گر رہی ہیں اور انسان خاک و خون میں لوٹ رہے ہیں۔ ۵ فروری کا دن تھا، اور رمضان کے مبارک مہینہ کا چوتھا روزہ۔ پاکستان میں پوری قوم کشمیر میں مجاہدین کے جہاد اور ان کی قربانیوں کے ساتھ یک جہتی کا اظہار کر رہی تھی، اور بھارتی فوجوں کے ہاتھوں مسلمانوں کی جانوں کی ہلاکت، ان پر وحشیانہ مظالم اور ان کی عزتوں کی پامالی کے خلاف صدائے احتجاج بنی ہوئی تھی۔ کراچی میں، لیاقت آباد میں شارع عام پر کشمیر کے لیے فنڈ جمع

کرنے کے لیے کیمپ لگا ہوا تھا کہ روز روشن میں ایک سرخ گاڑی نمودار ہوئی' اس میں بیٹھے لوگوں نے کیمپ میں جمع لوگوں پر گولیوں کی بارش کر دی اور ان کو سرخ سرخ خون میں نہلا دیا۔ کم سے کم ۱۱ افراد ہلاک ہوگئے' اور ۱۴ شدید زخمی۔ چند گھنٹے گزرے تھے' تراویح کی نماز ہو رہی تھی کہ نارتھ کراچی کی مسجد باب الاسلام پر ایک سفید رنگ کی گاڑی نمودار ہوئی' اور نمازیوں پر فائر کھول دیا۔ ۶ افراد یہاں ہلاک ہوگئے۔ اس روز کراچی میں لاشوں کا ایک دن کا ٹوٹل ۱۹ رہا۔ ایک دن بعد ایم کیو ایم (الطاف) اور ایم کیو ایم حقیقی کے درمیان خون ریزی میں ۹ آدمی ہلاک ہوئے۔ یہ "میچ" مسلسل جاری ہے۔ ایک دن پہلے باہمی خون ریزی میں ۱۰ آدمی ہلاک ہوئے' جن میں ۷ شیعہ تھے۔ غالباً مسجد باب الاسلام میں خون ریزی اسی کا شاخسانہ تھی۔ یہ کراچی کی ساتویں مسجد تھی جو اس طرح قتل و غارت کا نشانہ بنی۔

کراچی کوئی جزیرہ نہیں' ملک کا ایک حصہ ہے۔ دوسری جگہ' دوسرے اسباب سے' خون ریزی ہو رہی ہے' جو کچھ کم نہیں' لیکن پورے ملک کا کراچی بن جانا کیا کوئی بعید بات ہے؟

کراچی میں یہ سلسلہ ایک طویل عرصہ سے چل رہا ہے۔ مرنے والوں کی تعداد ہزار سے تجاوز کر چکی ہے۔ اگرچہ ابھی کوبے اور چیچنیا کے برابر نہیں پہنچی' لیکن اچانک مرجانے کے مقابلہ میں آہستہ آہستہ روز مرنے کا زخم اور گھاؤ جسدِ اجتماعی کے لیے زیادہ اذیت ناک اور خوف ناک ہوتا ہے۔ پاکستان اسی اذیت' دہشت اور ہلاکت کے عمل سے دوچار ہو رہا ہے۔

یہ آفت بھی کوبے اور یورپ کی طرح سماوی نہیں' بلکہ ہمارے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی ہے۔ یہ چیچنیا کی طرح روسیوں کی مسلط کردہ نہیں' یہ ہماری اپنی مسلط کردہ ہے۔ اس سے انکار نہیں کہ اس میں دشمن کا ہاتھ ہے۔ حکومت بھی برسوں سے یہی کہہ رہی ہے' اگرچہ آج تک کسی حکومت نے بھی اپنا الزام پبلک کے سامنے ثابت نہیں کیا ہے۔ لیکن دشمن بھی اسی وقت گھستا ہے جب ہم خود شگاف پیدا کر دیتے ہیں۔ چیچنیا کے مسلمانوں کی طرح جانوں کی یہ قربانی ہم اپنے ارادہ سے کسی اعلیٰ مقصد کے لیے بھی پیش نہیں کر رہے۔ اس موت سے کسی زندگی کے مقدر ہونے کا امکان نہیں' اس خون سے کوئی سحر پیدا نہیں ہوگی۔ نہ مہاجر یا سندھی کے لیے' نہ کراچی کے لیے' نہ پاکستان کے لیے۔ یہ تفرقہ' باہمی بغض و عداوت اور دنیا کی پست اغراض کی خاطر اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ (تم کچھ کتاب پر ایمان رکھتے ہو' اور کچھ کا انکار) کی رَوِش کا نتیجہ ہے' اور قانونِ الٰہی کے تحت اس کا انجام دنیا میں رسوائی' ذلت و مسکنت' دشمنوں کا تسلط اور اللہ کا غضب ہے۔ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِیلًا۔

زلزلہ پیماؤں کا جال بھی زلزلہ کی خبر نہیں دے سکتا' لیکن ہم جس زلزلہ کے جھٹکوں سے روز

دوچار ہیں ان کی خبر آسمانی کتاب بھی ۱۴ سو سال سے دے رہی ہے ' اہلِ دانش بھی عرصہ سے دے رہے ہیں۔ لاس اینجلز اور کوبے کے زلزلے ایسے مقامات پر آسکتے ہیں جہاں وہم و گمان نہ ہو' یہ زلزلے تو ٹھیک انھی مقامات (fault lines) پر آرہے ہیں جہاں نقشہ بتا رہا ہے کہ آنا چاہیں۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی بے پناہ ترقی اور بے مثال اقتصادی ترقی ' دولت کے انبار ' کارخانوں کے ہجوم اور موٹروے کوبے اور یورپ کو تباہی اور غرقابی نہیں بچا سکے ' ہمیں کیسے بچاسکیں گے ' جب کہ ہمارے زلزلے ہمارے اعمال و اخلاق کا پھل ہیں۔ بلکہ اگر یورپ کا سیلاب اس زہر کا نتیجہ ہے جو ٹیکنالوجی نے فضا میں گھول دیا ہے ' تو فکرِ معیشت جو زہر ہمارے دلوں کی اور قومی زندگی کی رگوں میں گھول رہی ہے اس کے سیلاب سے ہم کیسے بچیں گے۔

لیکن ہمارے لیے بچنا (ٹوکیو کی طرح) ناممکن نہیں ' بلکہ راستہ صاف اور سیدھا ہے ' آسان بھی۔ ہاں ' اس کے لیے ہمارے ۱۲ کروڑ باشندوں کو چیچنیا کے ۱۲ لاکھ مسلمانوں کی طرح پہاڑوں جیسا حوصلہ اور عزم ضرور چاہیے: "اگر بستی والے ایمان اور تقویٰ اختیار کریں ' تو ہم ان پر آسمانوں اور زمین سے برکتوں کے دروازے کھول دیں گے"۔ مغرب کا انسان اسباب و علل کے چکر میں پھنسا ہوا ہے ' اور اسباب ہی کو ارباب من دون اللہ بنا رکھا ہے۔ لیکن اسباب کے پیچھے غیب میں ' رب السموات والارض کے حقیقی دستِ کارفرما کا جلوہ ' انسان انبیا کی انگلی پکڑے بغیر نہیں دیکھ سکتا۔ نجات کا یہ راستہ اور ترقی کا یہ نسخہ اس رب حقیقی کا بتایا ہوا راستہ اور نسخہ ہے۔

ایمان اور تقویٰ ہی ہمیں اس مقام پر پہنچائے گا کہ ہم اللہ کے علاوہ ہر شے کی غلامی ترک کر کے ---- سیم و زر ہو ' سائنس اور ٹیکنالوجی ہو ' مغرب اور امریکہ ہو۔ آزادی و حریت حاصل کر لیں گے۔ پھر ہماری تقدیر کی تشکیل کسی کی مٹھی میں نہ ہوگی ' ہماری زندگی کی نقشہ گری کسی کے اختیار میں نہ ہو گی ' کوئی سامری ہمیں سیم و زر کے جال میں باندھ کر بے بس نہیں کر سکے گا ' پھر ہمارے ہاں کوئی قرضوں کے انبار ' کوئی "مہران بنک" ' کوئی "گوادر" ' کوئی "سیمنٹ اسٹیشن" نہ ہو گا۔ پھر ہمیں ان حکومتوں سے بھی نجات مل سکے گی جو ایک کے بعد ایک پے در پے ہمیں غلامی کی زنجیروں میں جکڑتی چلی جارہی ہیں۔

رمضان کے اختتام اور عید کے جشن سے زیادہ مناسب اور بہتر موقعہ اس بات کے لیے کیا ہو گا کہ ہم عزم مصمم کر کے ' خلوص نیت کے ساتھ ' جوش اور جذبہ سے بھرے ہوئے ' قوم کے ایک ایک مرد ' عورت ' جوان اور بچہ کو اس راہِ سرفرازی پر گامزن کرنے کے لیے کھڑے ہو جائیں جو قرآن نے ہمارے سامنے کھولی ہے۔

۶۰ سال پہلے

اب یہ نوبت پہنچی ہے کہ ایک مسلمان عورت قرآن و حدیث کے صریح احکام کی خلاف ورزی کر کے 'اپنی زینت کا اظہار کرتی ہوئی نکلتی ہے' انگریزی ہوٹلوں میں جاکر لنچ اور ڈنر کھاتی ہے' سینما ہال میں جاکر مردوں کے درمیان بیٹھتی ہے' بازاروں میں پھر کر شاپنگ کرتی ہے' اور ستم بالائے ستم یہ ہے کہ قانونِ اسلامی کے خلاف یہ تمام افعال کرنے پر شرمندہ اور نادم ہونے کے بجائے فخر کے ساتھ اپنے ان کارناموں کو بیان کرتی ہے' اور الٹا اس بے چاری عفیفہ کو قابلِ ملامت ٹھہراتی ہے جس نے قانونِ اسلام کی پیروی میں حجابِ شرعی کو چھوڑنے سے انکار کیا' جسے مردوں کے درمیان بے حجابانہ تماشا بنتے کرتے ہوئے شرم آئی' جس کو بازاروں کے چکر لگانا' تاج اور گرین کے مزے چکھنا' سیرگاہوں کی ہوائیں کھانا' اس چار دیواری کی بے لطفیوں کے مقابلہ میں پسند نہ آیا جس کی حدود میں رہنے کا اس کے خدا اور اس کے رسولؐ نے اسے حکم دیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اسلام کے خلاف بغاوت کی اسپرٹ مردوں سے گزر کر عورتوں تک بھی پہنچتی جارہی ہے' وہ بھی اسلام کے قوانین کی خلاف ورزی کو نہیں بلکہ اس کی پیروی کو اس قابل سمجھنے لگی ہیں کہ ایک مسلمان عورت اس پر شرمندہ و نادم ہو۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ خدارا بتاؤ کہ پرانی دیندار خاتونوں کی گودوں میں پرورش پانے کے باوجود جب تمہارا یہ حال ہوا ہے' تو جب تمہاری عورتیں بھی غیرتِ ایمانی سے بیگانہ اور اطاعت خدا اور رسولؐ کی حدود سے باہر ہو جائیں گی تو ان نسلوں کا کیا حشر ہوگا' جو ان نئی فرنگیت مآب خواتین کی گودوں میں پرورش پاکر نکلیں گی؟ جو بچے آنکھ کھولتے ہی اپنے گردوپیش فرنگیت ہی فرنگیت کے آثار دیکھیں گے' جن کی معصوم نگاہیں اسلامی تہذیب و تمدن کی کسی علامت سے آشنا نہ ہوں گی' جن کے کانوں میں کبھی خدا و رسولؐ کی باتیں نہ پڑیں گی' جن کے دل و دماغ کی لوحِ سادہ پر ابتدا ہی سے فرنگیت کے نقوش ثبت ہو جائیں گے' کیا یہ امید کی جاسکتی ہے کہ وہ اپنے جذبات' خیالات' اخلاق' اعمال' غرض کسی حیثیت سے بھی مسلمان ہوں گے؟

(سید ابوالاعلیٰ مودودی "ترجمان القرآن" جلد ۵ عدد ۵ ص ۸-۹ ذیقعدہ ۱۳۵۳ھ مارچ ۱۹۳۵)

رمضان المبارک میں مطالعہ کرنے کے لیے

ایمان افروز کتابیں

۱۔ قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں	سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ	27-/
۲۔ انتخاب قرآن	محمد فاروق خاں ایم اے	19/50
۳۔ درس قرآن	محمد یوسف اصلاحی	21-/
۴۔ تفسیر سورہ یٰس	"	21-/
۵۔ آسان تفسیر سورہ نور	محمد عبدالحیٔ	18-/
۶۔ آسان تفسیر چوبیسواں پارہ	"	42-/
۷۔ آسان تفسیر تیسواں پارہ	"	72-/
۸۔ سنت کی آئینی حیثیت	سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ	57-/
۹۔ اسلامی عبادات پر ایک تحقیقی نظر	سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ	18-/
۱۰۔ اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی	"	57-/
۱۱۔ رسائل و مسائل اول تا پنجم	"	291-/
۱۲۔ کشف المحجوب	سید علی ہجویریؒ ۔ ترجمہ میاں طفیل محمد	72-/
۱۳۔ کتاب الزکوٰۃ	علامہ ابن رشدؒ	7/50
۱۴۔ اسلام آپ سے کیا چاہتا ہے؟	سید حامد علی	21-/
۱۵۔ اسلام ایک نظر میں	مولانا صدر الدین اصلاحی	48-/
۱۶۔ فریضہ اقامت دین	"	27-/
۱۷۔ دین کا مطالعہ کیسے کریں	"	6-/
۱۸۔ ترجمان الحدیث اول ۔ دوم	سید محمود حسن فاضل دیوبند	138-/
۱۹۔ سر اجا منیرا	شاہدہ ناز قاضی	96-/
۲۰۔ اسلام کے بنیادی عقائد	ابو عبدالرحمٰن شبیر بن نور	39-/
۲۱۔ کبیرہ گناہوں کی حقیقت	"	81-/
۲۲۔ قیامت کی ہولناکیاں	عبدالملک الکلیب ترجمہ شبیر بن نور	90-/
۲۳۔ آداب زندگی	محمد یوسف اصلاحی	54-/

پاکستان اور اسلام

اسلامی نظریے کی طرف بڑھنے میں کون سی قوتیں مزاحمت کر رہی ہیں؟

ایک' عام مسلمان کی جہالت اور اسلامی تربیت سے محرومی۔

ہم جب کبھی اس بات پر زور دیتے ہیں کہ مسلمان ممالک میں' اور اسی طرح پاکستان میں بھی' مسلمان من حیث القوم اسلام کے دلدادہ ہیں' تو اس سے ہماری مراد صرف یہ ہوتی ہے کہ ان کے جذبات و احساسات اسلامی ہیں' اور روایات کا گہرا اثر ان کو اسلام سے وابستہ رکھے ہوئے ہے۔ لیکن اس واقعہ سے انکار نہیں کیا جاسکتا' اور یہ بالکل ایک بدیہی حقیقت ہے کہ ان عام مسلمانوں کی عظیم اکثریت جس اسلام کی دلدادہ ہے' اس سے نہ تو یہ اچھی طرح واقف ہے اور نہ اس کے اصولوں کے مطابق اس کو اخلاقی تربیت ملی ہے۔

یہ ہماری بہت بڑی بدقسمتی ہے کہ مغربی استعمار کی آمد سے کئی صدی پہلے سے مسلمانوں کی حکومتیں اپنے بنیادی فرائض سے غافل رہیں اور انھوں نے مسلم عوام کو اسلامی تعلیم و تربیت دینے کا فرض پوری طرح انجام نہیں دیا۔ اس کے بعد جب مغربی استعمار مختلف اسلامی ملکوں میں اور خود ہمارے ملک میں آیا' تو اس نے ہمارے عقاید' اخلاق اور تہذیب و تمدن کی جڑیں ہلا ڈالیں۔ اس نے ہم پر ایک ایسا نظامِ تعلیم' اور نظامِ سیاست و معیشت اور نظامِ قانون و تمدن مسلط کیا' جو ہمارے فلسفہ حیات اور نظامِ زندگی سے پوری طرح متصادم تھا۔

ان ساری چیزوں کے اثرات مسلمان قوموں میں ہر جگہ پائے جاتے ہیں' اور اپنے ملک میں بھی ہم ان سے بری طرح متاثر ہیں۔ ہم یہ ضرور سمجھتے ہیں کہ اگر یہاں اسلامی نظامِ حکومت قائم ہو جائے تو عوام کے جذبات و احساسات ان شاءاللہ اس کا ساتھ دیں گے۔ لیکن ہمیں یہ غلط فہمی نہیں ہے کہ قوم کی جہالت و جاہلیت اس کے قائم ہونے اور چلنے میں مزاحم نہ ہوگی۔ لامحالہ اسلام کے لیے کام کرنے والوں کو کافی مدت تک جان مار کر محنت کرنا ہوگی' تاکہ قوم کی بگڑی ہوئی عادات و خصائل کو درست کر

کے اس نظام کے ساتھ ہم آہنگ کیا جائے جسے وہ جذباتی طور پر دل سے پسند کرتی ہے۔

اس معاملہ میں اصلاح کرنے والوں کو بڑی حکمت کے ساتھ ایک تدریجی پروگرام اختیار کرنا ہو گا۔ اگر حکمت اور تدریج کو وہ ملحوظ نہ رکھیں ' اور کسی وقت بھی اصلاح کی پوری خوراک بیک وقت دے ڈالنے کی کوشش کریں ' تو سارا کام بگاڑ کر رکھ دیں گے۔

دوسری مزاحم قوت ہمارے مذہبی طبقوں کا جمود ہے۔

ان لوگوں کو پوری طرح اس بات کا احساس و ادراک نہیں ہے کہ اسلام میں درحقیقت ثبات اور حرکت کے درمیان کس طرح توازن قائم کیا گیا ہے۔ کتاب و سنت کی رو سے مستقل طور پر ثابت و قائم کیا چیزیں رہنی چاہییں ' اور حرکت کن پہلوؤں میں اور کن امور میں ہونی چاہیے جس سے ہم زمانے کی ترقی کے ساتھ ساتھ آگے چل سکیں۔ ان کے نزدیک کلیات و اصول اور منصوص احکام سے لے کر استنباطی جزئیات و فروع تک ہر چیز اٹل ہے۔

اس جمود کی وجہ سے بھی بہت سی رکاوٹیں اب تک پیش آئی ہیں ' اور آگے بھی پیش آنے کا خطرہ ہے۔ اگر اصلاح کے لیے کام کرنے والے لوگ وہ ہوں جو قرآن و سنت اور فقہ اور اسلامی تاریخ پر اچھی طرح نظر رکھتے ہوں ' فرقہ بندی کے تعصبات میں مبتلا نہ ہوں ' اور اپنے مزاج میں حکیمانہ اعتدال اور صبر و تحمل بھی رکھتے ہوں ' تو یہ مزاحمت تھوڑی یا بہت مشکلات کے باوجود رفع ہو سکتی ہے۔ ورنہ کم علم اور غیر معتدل لوگوں کے ہاتھوں یہ کام ہونے کی صورت میں سخت اندیشہ ہے کہ ہم اصلاح کرنے کے بجائے ملک میں مذہبی جھگڑے برپا کر دیں گے۔

تیسری مزاحم طاقت ملک کے اندر نہیں بلکہ باہر ہے۔

ہمارے مغربی دوست جن کے ساتھ ہم بہت سے مالی و معاشی و سیاسی رشتوں میں بندھے ہوئے ہیں ' اور جنھیں ہمارے آزاد ہو جانے کے باوجود ہماری قسمت پر اثر ڈالنے کے بہت سے مواقع حاصل ہیں ' وہ خود چاہے کتنے ہی عیسائی ہوں اور عیسائیت پر فخر کریں اور کیمونزم کے مقابلے میں مذہب کے علمبردار بنیں ' مگر مسلمان قوموں کو وہ مسلمان نہیں دیکھنا چاہتے۔ میرا احساس یہ ہے کہ وہ اب تک کیمونزم کے مقابلے میں اسلام کو زیادہ خطرناک سمجھتے ہیں۔ ان کی خواہش یہ تو ضرور ہے کہ مسلمان قومیں مذہب کی بنیاد پر کیمونزم کی مخالف ہوں اور اس کے مقابلے میں ان کا ساتھ دیں۔ لیکن جب بھی کسی ملک کو وہ اسلام کی طرف پلٹتے دیکھتے ہیں اور انھیں خطرہ ہوتا ہے کہ اب وہاں اسلام کا بول بالا ہونے والا ہے ' تو اپنی تمام جمہوریت نوازی کو چھوڑ کر اور اپنے تمام اصول آئین و قانون کو نظرانداز کر کے وہ اس قوم کے اندر غیر آئینی انقلاب کی ہمت افزائی کرنے پر اتر آتے ہیں۔ جمہوریت کے مقابلے میں

ڈکٹیٹرشپ کی حمایت کرنے لگتے ہیں اور انتہائی وحشیانہ ظلم و ستم جو دینی رہنماؤں اور دینی کارکنوں پر کیا جائے ' اس پر نعرہ ہائے تحسین و آفرین بلند کرتے ہیں - یہ تماشا ہم کئی برس سے مسلسل دیکھ رہے ہیں ' اور ہمیں یہ یقین ہو چکا ہے کہ مسلم ممالک کے اندر اسلام کی نشات ثانیہ کے راستے میں صرف اندرونی طاقتیں ہی مزاحم نہیں ہیں بلکہ ان کی پشت پر یہ بیرونی طاقتیں بھی ہیں - اس کے دو سرے معنی یہ ہیں کہ ہماری جنگ آزادی ابھی ختم نہیں ہوئی ہے - ہمیں آزادی کے لیے ابھی مزید لڑائی لڑنی ہے -

پھر بدقسمتی سے اس وقت دنیا کی سب سے بڑی بین الاقوامی طاقت یعنی امریکا پر ایک شیطان کا سایا بھی ہے - اس شیطان کا نام ہے یہود -

بین الاقوامی سازشیوں کے اس خطرناک گروہ کے ہاتھ میں بہت بڑی معاشی طاقت بھی ہے اور پریس کی طاقت بھی - خصوصیت کے ساتھ امریکا کی خارجہ سیاست پر اس کو جو تسلط حاصل ہے ' اس نے تمام امریکیوں کو ان کی خواہش اور ارادے کے بغیر نہ صرف عرب سے ' بلکہ تمام دنیا کے مسلمانوں سے ' زبردستی بھڑا دیا ہے - یہ یہودی حقیقت میں امریکا کے لیے ' انگریزی محاورے کے مطابق ' نفس امارہ evil genius بنے ہوئے ہیں -

جس مسلمان قوم کے اندر مذہبی احیا کے آثار نمودار ہوتے ہیں ' یہ اس کے متعلق فوراً دنیا میں خطرے کی گھنٹی بجانے لگتے ہیں اور اس کی خبریں دنیا کو اس طرح سناتے ہیں جیسے دنیا میں کوئی بڑی آفت آنے والی ہے - اگر کسی مسلمان قوم میں الحاد اور بے دینی کا زور ہو رہا ہو تو یہ اس پر بغلیں بجاتے ہیں اور دنیا بھر کو خبر دیتے ہیں کہ وہ قوم بڑی ترقی کر رہی ہے - بہت progressive ہو گئی ہے - اگر کہیں کسی دینی تحریک کو کچلا جا رہا ہو ' مقدمے چلائے بغیر لوگوں کو قید کیا جا رہا ہو ' فوجی عدالتوں میں بالکل مضحکہ خیز طریقوں پر مقدمات چلا کر لوگوں کو پھانسیوں کی سزائیں دی جا رہی ہوں تو اس کی خبریں دنیا کو اس انداز سے دیتے ہیں گویا کوئی بہت بڑا نیک کام کیا جا رہا ہے اور کوئی شرم ان کو ایسے افعال کی تحسین کرتے وقت لاحق نہیں ہوتی - اگر کسی مسلم ملک میں جمہوریت کو بالائے طاق رکھ کر اور آئین و قانون کی مٹی پلید کر کے کوئی ڈکٹیٹرشپ قائم کر دی جائے ' تو اس کا خیر مقدم کرتے ہیں اور دنیا کو یقین دلاتے ہیں کہ مسلمان قومیں جمہوریت کے قابل ہی نہیں ہیں ' ان کے لیے تو ڈکٹیٹرشپ ہی موزوں ہے -

امریکا کے عام باشندے ذرا محسوس نہیں کرتے کہ اس طرح اپنی اغراض کے لیے یہودی سرمایہ دار اور یہودی پریس ان کو گمراہ کر کے ایک خطرناک بین الاقوامی الجھن میں مبتلا کر رہے ہیں - وہ تو یہ دیکھتے ہیں کہ عملاً یہی اس وقت امریکا کی پالیسی ہے اور یہودیوں کے زیر اثر اس کی سیاسی طاقت اسی پالیسی کے لیے استعمال ہو رہی ہے - اس کی وجہ سے امریکا کی وہ تمام مالی اور فنی امداد جو وہ مسلمان

ملکوں کو دیتا ہے ' بجائے کوئی خیرسگالی پیدا کرنے کے ' الٹا اثر مرتب کر رہی ہے۔ اس کی وجہ سے مسلمان ' اس کے باوجود کہ کمیونزم کے مقابلے میں ان کا مفاد مغربی طاقتوں سے متحد ہے ' اپنے اندر ان کی حمایت کے لیے کوئی جذبہ نہیں پاتے بلکہ ان کے دلوں میں کمیونسٹ بلاک سے کچھ کم نفرت مغربی بلاک کے لیے نہیں ہے۔

مسلمان یہ سوچتے ہیں کہ ہم آخر کمیونسٹ بلاک کے مقابلے میں مغربی بلاک کا ساتھ کیوں دیں؟ اگر ہماری عزیز اور محبوب قدریں دونوں کے ہاتھوں سے یکساں طور پر پامال ہوتی ہیں ' تو ہمارے عمل میں ایک کے مقابلے میں دوسرے کے لیے ہمدردی پیدا ہونے کی کیا معقول وجہ ہے۔ ایک قوم کے خواص تو اپنے مخصوص مفادات کے لیے سب کچھ کر سکتے ہیں۔ لیکن ایک قوم کے عوام میں لڑنے کا جذبہ صرف اسی حالت میں ابھرتا ہے جب کہ وہ اپنی عزیز و محبوب چیزوں کو خطرے میں دیکھتے ہیں اور ان کو بچانے کے لیے اٹھنے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ مسلمان بہرحال مغربی ممالک کے لیے کرائے کے سپاہی نہیں بن سکتے کہ محض مالی امداد لے کر وہ ان کی خاطر کمیونسٹ بلاک سے لڑیں۔ وہ اگر سچے جذبے کے ساتھ لڑ سکتے ہیں تو صرف اپنی تہذیب ' اپنے تمدن اور اپنے عقاید و نظریات کو بچانے کے لیے لڑ سکتے ہیں۔ اگر اسی چیز کو مغربی طاقتیں اپنی مداخلت یا ریشہ دوانیوں سے مسلمان ممالک میں پامال کرا دیں تو پھر انھیں مسلمان قوموں سے کسی تائید کی امید نہیں رکھنی چاہیے۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ نوری السعید اور چیانگ کائی شیک کی قسم کے لوگ مختلف مسلمان ملکوں میں کھڑے کر کے وہ کچھ دنوں ان سے فائدہ اٹھاتی رہیں۔

بہرحال یہ تیسری مزاحمت مسلمان ممالک میں اسلام کا احیا چاہنے والوں کے لیے ایک بہت بڑا دردِ سری ہوئی ہے۔ جس کو بھی اس مقصد کے لیے ان ملکوں میں کام کرنا ہو ' وہ اس کی طرف سے آنکھیں بند نہیں کر سکتا۔ اس کو اپنے حساب میں رکھ کر ہی اسے اپنا پروگرام بنانا ہو گا۔

آپ کے نزدیک اسلامی نظریے کو عملاً بروئے کار لانے کے لیے کون سے اقدامات ضروری ہیں؟ سیاسی اور تہذیبی زندگی پر اس نظریے کے کیا اثرات مرتب ہونے چاہییں؟

سب سے پہلے جس چیز کی ضرورت ہے وہ تو اس ملک میں جمہوریت کی بحالی ہے۔ اس لیے کہ اگر اس ملک کی حیثیت اس گھوڑے کی سی ہو جس کے منہ میں لگام ڈال کر ہر طاقت ور شخص اس پر زبردستی سوار ہو جائے اور اسے اپنے راستے پر چلانا شروع کر دے ' تو ایسی حالت میں گھوڑے غریب کے لیے یہ سوچنا ہی لاحاصل ہے کہ وہ کدھر جانا چاہتا ہے ' اور اپنی مرضی کے راستے پر جانے کے لیے

اسے کیا کرنا چاہیے۔ہمیں سب سے پہلے اس حالت کو بدلنا چاہیے۔

ہم کو یہاں ایک آزادانہ جمہوری ماحول درکار ہے جس میں اظہار خیال' اجتماعی تنظیم اور سعی و جہد کی آزادی ہو' جس میں ہر شخص اپنے خیالات کے مطابق رائے عام کو ہموار کرنے کی کوشش کر سکے' جس میں رائے عام کا کسی نظریے کے حق میں ہموار ہو جانا ہی اس نظریے کے مطابق قیادت میں تبدیلی ہو جانے کے لیے کافی ہو' اور جس میں قیادت کی تبدیلی کے لیے ایک پر امن آئینی راستہ موجود ہو۔ایسے ماحول میں تو یہ ممکن ہے 'کہ میں اپنے نظریے کو بروئے کار لانے کے لیے کچھ اقدامات سوچ سکوں ' انھیں بیان کر سکوں 'لوگ ان کے صحیح یا غلط ہونے کے متعلق کوئی رائے قائم کر سکیں 'اور جن کے نزدیک وہ صحیح ہوں' وہ میرے ساتھ مل کر عملاً ان اقدامات کے لیے کوشش کر سکیں۔ لیکن اگر یہ ماحول موجود نہ ہو تو میرا اور آپ کا کسی قسم کے اقدامات کو سوچنا بے کار ہے ۔پھر تو سوچنا صرف ان لوگوں کا کام ہے جو گھوڑے پر سوار ہونے کی طاقت رکھتے ہوں۔

یہ لازمی اور ابتدائی شرط پوری ہونے کے بعد' جو اقدامات اس نظریے کو بروئے کار لانے کے لیے درکار ہیں وہ تین بڑے بڑے شعبوں پر مشتمل ہونے چاہییں ۔یا دوسرے الفاظ میں اس مقصد کے لیے بیک وقت تین سمتوں میں متوازن طریقے سے کوشش کی جانی چاہیے۔

ایک 'تبلیغ و تعلیم اور تعمیر فکر۔اس سے میری مراد یہ ہے کہ ہم اپنے ملک کی آبادی کو وسیع اور عمیق پیمانے پر اسلام کے عقاید' اصول' احکام اور اخلاقی و عملی تقاضوں سے آگاہ کریں۔ غیر اسلامی نظریات و افکار اور نظام زندگی کے جو اثرات ان کے ذہن میں تھوڑے یا بہت اتر گئے ہیں' ان کو صاف کریں۔مختلف ذہنی طبقات کو ان کی استعداد کے مطابق یہ سمجھائیں کہ اسلام کے مطابق ہماری زندگی کے مختلف شعبوں کی تشکیل کس طرح ہونی چاہیے اور مختلف مسائل حیات کو کیسے حل کرنا چاہیے۔

دوسرے ' اصلاح اخلاق ۔یعنی لوگوں کی عملی زندگی کو اسلام کے تقاضوں کے مطابق درست کرنا اور ان غیر اسلامی اثرات کو عملاً ان کی زندگی سے خارج کرنا جو جہالت و جاہلیت کی وجہ سے یا قدیم غیر اسلامی تقلید کے باعث یا مغربی تہذیب و تمدن کی بدولت ان کے اندر پھیلے ہوئے ہیں۔

تیسرے 'نظام حکومت کی اصلاح ۔تاکہ حکومت کے ذرائع و وسائل اور اس کے قوانین اور اس کے انتظامی اختیارات اسلام کے مطابق ہماری زندگی کی تعمیر نو میں استعمال ہو سکیں' اور بالآخر ہم دنیا میں اس مشن کو پورا کرنے کے قابل ہو جائیں جو ایک اُمت مُسلمہ ہونے کی حیثیت سے خدا نے ہمارے سپرد کیا ہے۔(چراغ راہ 'کراچی 'نظریہ پاکستان نمبر' دسمبر ۱۹۶۰' ص ۳۴۹-۳۵۷)

داعی کا زادِ راہ

فاما الیتیم فلا تقھر و اما السائل فلا تنھر و اما بنعمۃ ربک فحدث (الضحیٰ ۹۳: ۹-۱۱)

لہٰذا یتیم پر سختی نہ کرو اور سائل کو نہ جھڑکو اور اپنے رب کی نعمت کا اظہار کرو۔ (تفہیم القرآن: سید ابوالاعلیٰ مودودی ؒ)

سو جو یتیم ہو اس کو مت دبا، اور جو مانگتا ہو اس کو مت جھڑک، اور جو احسان ہے تیرے رب کا سو بیان کر (موضح الفرقان: مولانا محمود الحسن ؒ)۔

تفسیر القرآن العظیم: حافظ عماد الدین اسماعیل بن کثیرؒ

فرماتا ہے کہ یتیم کو حقیر نہ کر، نہ ڈانٹ ڈپٹ کر، بلکہ اس کے ساتھ احسان و سلوک کر، اور اپنی یتیمی کو نہ بھول جا۔ قتادہؒ فرماتے ہیں، یتیم کے لیے ایسا ہو جانا چاہیے جیسے سگا باپ اپنی اولاد پر مہربان ہوتا ہے۔

سائل کو نہ جھڑک۔ جس طرح تم بے راہ تھے اور خدا نے ہدایت دی، تو اب جو تم سے علمی باتیں پوچھے صحیح راستہ دریافت کرے، تم اسے ڈانٹ ڈپٹ نہ کرو۔ ابن اسحاقؒ کہتے ہیں: غریب، مسکین، ضعیف بندوں پر تکبر اور جبر نہ کرو، انھیں ڈانٹو ڈپٹو نہیں، برا بھلا نہ کہو، سخت سست نہ بولو۔ قتادہؒ کہتے ہیں: اگر مسکین کو کچھ نہ دے سکو، تو بھی بھلا اور اچھا جواب دو، نرمی اور رحم کے ساتھ واپس کرو۔

پھر فرمایا کہ اپنے رب کی نعمتیں بیان کرتے رہو۔ یعنی جس طرح تمھاری فقیری کو ہم نے تونگری سے بدل دیا، تم بھی ہماری ان نعمتوں کو بیان کرتے رہو۔ اسی لیے حضورؐ کی دعاؤں میں یہ بھی تھا و اجعلنا شاکرین لنعمتک، مثنین بھا علیک، قابلیھا، و اتمھا علینا، یعنی خدایا ہمیں اپنی نعمتوں کی شکر گزاری کرنے والا، ان کی وجہ سے تیری ثنا بیان کرنے والا، ان کا اقرار کرنے والا کر دے، اور ان نعمتوں کو ہمیں بھرپور دے۔ ابونضرہؒ فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کا یہ خیال تھا کہ نعمتوں کی شکر گزاری میں یہ

بھی داخل ہے کہ ان کا بیان ہو۔ مسند احمد میں ہے جس نے تھوڑے پر شکر نہ کیا اس نے زیادہ پر بھی شکر نہیں کیا' لوگوں کی شکر گزاری جس نے نہ کی اس نے خدا کی بھی نہیں کی۔ صحیحین میں حضرت انس ؓ سے مروی ہے کہ مہاجرین نے کہا' یارسول اللہ ﷺ' انصار ؓ سارا کا سارا اجر لے گئے۔ فرمایا' نہیں' جب تک کہ تم ان کے لیے دعا کیا کرو اور ان کی تعریف کرتے رہو۔ احمد اور ابوداؤد میں ہے: اس نے خدا کی شکر گزاری نہیں کی جس نے لوگوں کی شکر گزاری نہ کی۔ ابوداؤد کی ایک اور حدیث میں ہے: جسے کوئی نعمت ملی اور اس نے اسے بیان کیا' تو وہ شکر گزار ہے۔ اور جس نے اسے چھپایا' اس نے ناشکری کی۔ ایک اور روایت میں ہے کہ جسے کوئی چیز دی جائے' اسے چاہیے کہ ہو سکے تو بدلہ اتار دے۔ اگر نہ ہو سکے تو اس کی تعریف کرے۔ جس نے تعریف کی وہ شکر گزار ہوا' اور جس نے اس نعمت کا اظہار نہ کیا اس نے ناشکری کی۔

مجاہد ؒ فرماتے ہیں یہاں نعمت سے مراد نبوت ہے' ایک روایت میں ہے' قرآن مراد ہے۔ حضرت علی ؓ فرماتے ہیں' مطلب یہ ہے کہ جو بھلائی کی باتیں تم کو معلوم ہیں وہ اپنے بھائیوں سے بھی بیان کرو۔ ابن اسحاق ؒ کہتے ہیں جو نعمت نبوت کی تمھیں ملی ہے اسے بیان کرو' اس کا چرچا کرو اور اس کی طرف لوگوں کو دعوت دو۔

مواہب الرحمن: مولانا امیر علی ؒ

آپ ﷺ کو پہلے سے وصیت فرما کر رحمت اللعالمین بنا دیا' لہٰذا آگے یتیم و مسکین کے بارے میں وصیت فرمائی۔

کلمہ فاما پہلے اجمال کی تفصیل ہوتا ہے۔ گویا آیات سابقہ میں اپنے ضعیف بندوں کے حق میں مہربانی کی وصیت کر کے یہاں تفصیل فرمائی۔ یہ مہربانی اس طرح کہ اگر یتیم بچہ ہو تو جن باتوں سے وہ مقہور ہوتا ہو اور دل شکستہ ہو کر دب جاتا ہو ایسی کوئی بات نہ کیجیو۔ یعنی ایسی بات نہ کرنا کہ جس میں اس کی ذلت و اہانت ہو' اس کے ساتھ لطف و احسان کیجیو۔ فراء ؒ نے کہا کہ اس سے یہ غرض ہے کہ یتیم کو بے وارث جان کر دبانا نہیں' جیسے عرب کے جاہل اپنے قرابتی یتیموں کے مال لے کر خرد بُرد کر جاتے تھے (السراج)۔ اس آیت سے گویا امت کو نیک طریقے سے نصیحت کرنا مقصود ہے۔ ہر شخص یاد کرے کہ اگر وہ بجائے اس یتیم کے ہوتا تو قہر سے اس کا دل کس قدر ٹوٹ جاتا' پس جب دل پر اثر ہو گا تو یتیموں سے ظلم کرنا دفع ہو گا۔

آیت میں سائل سے ہر قسم کا سائل جس کا سوال پورا کرنا ثواب میں داخل ہے' مراد لینا بہتر ہے۔

خطیب ؒ وغیرہ نے لکھا کہ ابراہیم بن ادہم ؒ نے کہا کہ سائل اچھے لوگ ہوتے ہیں کہ ہمارا توشہ آخرت ہمارے لیے اپنے اوپر لادے چلتے ہیں۔ ابراہیم نخعی ؒ نے کہا کہ سائل ہمارے زندوں کی طرف سے ہمارے مُردوں کے یہاں سوغات پہنچانے والے ہیں۔ سائل تمھارے دروازوں پر آتا ہے اور پوچھتا ہے کہ کیا اپنے عزیز کے یہاں کچھ سوغات بھیجو گے۔ زمخشری ؒ نے لکھا کہ رسول اللہ ؐ نے فرمایا کہ جب تو نے سائل کو تین مرتبہ جواب دے دیا' وہ نہیں گیا' تو پھر اس کو جھڑکنے میں تجھ پر ملامت نہیں ہے۔ فتاویٰ عالمگیریہ میں ہے کہ جو لوگ مسجدوں میں نماز پڑھنے والوں سے سوال کرتے ہیں ان کو نہ دینا چاہیے اور ان کو اس حرکت سے منع کیا جائے۔ یہ فقہ اس حدیث سے ہے کہ ایک شخص نے مسجد میں بعد نماز کے کہا کہ کسی نے میرا اونٹ' اس صفت کا جو گم ہو گیا ہے' دیکھا ہو تو بتلا دے۔ آنحضرت ؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تیرا اونٹ تجھے نہ پھیرے۔ ارے تو نے نہ جانا کہ مسجدیں اس کام کے لیے نہیں بنائی گئی ہیں (کمافی الصحیح)۔

واضح ہو کہ لوگوں سے سوال کرنے کی مذمت میں احادیث بکثرت وارد ہیں۔ پس سائل خود دیکھ لے کہ اس کو سوال کرنا حلال ہے یا نہیں۔ فقہا نے فرمایا کہ اگر صبح کے کھانے کو موجود ہو تو اس وقت سوال نہیں جائز ہے' پھر شام کو سوال کرے۔ اور اب سنو کہ جس کسی سے سوال کیا جائے اس کو چاہیے کہ جہاں تک ہو سکے سائل کو محروم نہ پھیرے۔ کیونکہ کبھی راہ میں مسافر کا نفقہ جاتا رہتا ہے' اگرچہ سواری موجود ہوتی ہے اور لباس اچھا ہوتا ہے' تو وہ بضرورت سوال کرتا ہے۔ لہٰذا حدیث میں ہے کہ سائل کے واسطے حق ہے اگرچہ وہ گھوڑے پر آئے (ابن ماجہ وغیرہ)۔

یہ حدیث مشہور ہے' مگر امام احمد ؒ نے اس کو بے اصل قرار دیا ہے۔ ابو داؤد نے بھی اسے حضرت حسین ؓ سے روایت کیا ہے اور عراقی ؒ نے اس کی سند کو جید کہا ہے (روح المعانی)۔

اللہ تعالیٰ کی نعمتیں کوئی پوری نہیں بیان کر سکتا۔ پھر سب سے بڑی نعمت وہ ہے جس سے اللہ تعالیٰ کے نزدیک قرب و منزلت حاصل ہو' اور اسی قسم میں سے طاعات کی توفیق ہے۔ پھر مثلاً جس شخص نے رات میں تہجد وغیرہ عبادت کی' تو علما نے کہا کہ اگر یہ ایسا شخص ہے کہ اگر لوگوں سے بیان کرے تو لوگ اس کی پیروی کر کے خود بھی اسی طرح عبادت شروع کریں گے' تو اس کو بیان کرنا بہتر ہے' اور اگر یہ امید نہ ہو تو بیان نہ کرنا چاہیے۔

خطیب ؒ نے لکھا کہ نعمت کا بیان کرنا شکر ہے' لیکن یہ حکم آنحضرت ؐ کے واسطے عام اطلاق کے ساتھ خاص ہے۔ آپ ؐ کے امتیوں میں سے آدمی کے واسطے یہ بات جب ہی جائز ہو گی جب کہ اس بیان سے اس کی یہ غرض ہو کہ اللہ تعالیٰ کی مہربانی ظاہر کرے اور یہ کہ دوسرے لوگ اس کی پیروی

کریں' اور یہ خوف نہ ہو کہ لوگوں کے سامنے ظاہر ہو جانے سے اس کے نفس میں غرور و ناموری وغیرہ کا فتنہ ہو گا۔ پھر بھی بیان نہ کرنا افضل طریقہ ہے۔ اگر بیان کرنے میں فقط اسی قدر ہو کہ ریاکاروں کے ساتھ مشابہت ہوتی ہے تو کراہت کے لیے اسی قدر کافی ہے۔

خطیب" نے لکھا کہ نعمت قرآن ہے تو مطلب ہے اس کو پڑھو اور لوگوں کو پڑھ کے سناؤ۔ نبوت ہے تو مطلب یہ کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے تجھ پر نازل فرمایا وہ پیغام عموماً جہان کے لوگوں تک پہنچاؤ۔ اور بعض نے کہا کہ اس نعمت سے مراد توفیق ہے' یعنی اللہ تعالیٰ نے تجھے توفیق دی کہ تو یتیم و سائل کا حق بخوبی نگاہ رکھتا ہے۔ اب اس کو بیان کر تاکہ امتی تیری پیروی کریں۔

رازی" و خطیب" وغیرہ نے لکھا کہ اگر سوال ہو کہ یہاں نعمت اللہ تعالیٰ کا حق ہے' تو یتیم و سائل سے پیچھے کیوں بیان فرمایا' تو جواب ہے: اس لیے تاکہ بندوں کو اللہ تعالیٰ کی معرفت میں سے یہ بات سمجھ میں آجائے کہ اللہ تعالیٰ غنی ہے' اس کو کچھ پروا نہیں ہے۔ لیکن یتیم و سائل البتہ تمھاری طرح محتاج ہیں تو ان کے حق نہ مارو۔ واضح ہو کہ فحدث کی جگہ (فاخبر) نہیں کہا یعنی خبر دے دے۔ کیونکہ خبر دینا ایک مرتبہ ہو جاتا ہے اور (فاخبر) باتیں کرنا بار بار ہوتا ہے اور یہ بھولنے کی بات نہیں ہے۔

معارف القرآن: مفتی محمد شفیع"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یتیم کے ساتھ شفقت کے معاملے کی تاکید فرمائی اور اس کے ساتھ دل شکنی کا برتاؤ کرنے سے منع فرمایا۔ ارشاد ہے کہ مسلمانوں کے گھروں میں بہتر گھر وہ ہے جس میں کوئی یتیم ہو اور اس کے ساتھ احسان و محبت کا سلوک کیا جاتا ہو' اور سب سے بڑا گھر وہ ہے جس میں کوئی یتیم ہو اور اس کے ساتھ بُرا سلوک کیا جاتا ہو (رواہ البخاری فی الادب المفرد، و ابن ماجہ و البغوی، مظہری)۔

سائل کسی طرح مانے ہی نہیں تو بضرورت زجر بھی جائز ہے۔

مراد یہ ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا لوگوں کے سامنے ذکر کیا کریں کہ یہ بھی ایک طریقہ شکرگزاری کا ہے۔ یہاں تک کہ آدمی جو کسی آدمی پر احسان کرے اس کا بھی شکر ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ حدیث میں ہے جو شخص لوگوں کے احسان پر ان کا شکر نہیں کرتا وہ اللہ کا شکر نہیں کرے گا (رواہ احمد و رواتہ ثقات' مظہری)۔

ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ جو شخص تم پر کوئی احسان کرے تو چاہیے کہ آپ بھی اس کے احسان کا بدلہ دو' اور اگر مالی بدلہ دینے کی استطاعت نہیں تو یہی کرو کہ لوگوں کے سامنے اس کی تعریف کرو۔ کیونکہ جس نے لوگوں کے مجمع میں ان کی ثنا و تعریف کی تو اس نے شکرگزاری کا حق ادا کر دیا

(رواہ البغوی عن جابر بن عبداللہ، مظہری)۔

سورۃ الضحیٰ سے آخر قرآن تک ہر سورت کے ساتھ تکبیر کہنا سنت ہے اور اس تکبیر کے الفاظ شیخ صالح مصری نے لا الٰہ الا اللہ و اللہ اکبر بتلائے ہیں (مظہری)۔ ابن کثیر نے ہر سورت کے ختم پر اور بغوی نے ہر سورت کے شروع میں ایک مرتبہ تکبیر کہنے کو سنت کہا ہے۔ مظہری۔ دونوں میں سے جو صورت بھی اختیار کرے، سنت ادا ہو جائے گی۔ واللہ اعلم

سورۃ الضحیٰ سے آخر قرآن کریم تک بیشتر سورتوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر حق تعالیٰ کے خاص انعامات اور آپ کے مخصوص فضائل کا ذکر ہے، اور چند سورتوں میں قیامت اور اس کے احوال کا۔ قرآن حکیم کا شروع خود قرآن کی عظمت اور ناقابلِ شک و شبہ ہونے سے کیا گیا، اور ختم قرآن اس ذات کی عظمت و شان پر کیا گیا جس پر قرآن نازل ہوا۔

تدبر قرآن : مولانا امین احسن اصلاحی

یہ ان انعامات کا جو اوپر مذکور ہوئے، حق بیان ہوا ہے۔ انداز بیان ایسا ہے جس میں ان لوگوں پر نہایت لطیف تعریض بھی ہے جن کا حال پچھلی سورتوں میں بیان ہوا ہے کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے جو نعمتیں عطا فرمائیں ان کو اس کا انعام سمجھنے اور اس کے شکر گزار ہونے کی بجائے وہ اس گھمنڈ میں مبتلا ہو گئے کہ یہ جو کچھ ان کو ملا ہے یہ اسی کے حقدار ہیں۔ فرمایا کہ تم یہ روش نہ اختیار کرنا بلکہ تمھاری یتیمی کی حالت میں تمھارے رب نے جس طرح تم کو پناہ دی اسی طرح تم یتیموں کو پناہ دینا، ان پر شفقت اور کرم کی نظر رکھنا اور ان کے حقوق کی حفاظت کرنا۔ آیت وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا (الفجر ۸۹:۱۹) کے تحت ہم واضح کر چکے ہیں کہ جاہلی معاشرہ میں زور آور عصبات اور اقربا کمزور وارثوں اور یتیموں کے حقوق دبا بیٹھتے اور ساری وراثت تنہا سمیٹ لیتے۔ فَلَا تَقْهَرْ کے الفاظ میں اسی صورت حال کی طرف اشارہ ہے۔ فَلَا تَقْهَرْ کے معنی یہ ہیں کہ یتیم کو کمزور پا کر اس کو دبانے اور اس کے حقوق غصب کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ آنحضرت ؐ کو یہ تنبیہ ظاہر ہے کہ اس بنا پر نہیں کی گئی کہ آپ ؐ سے اس قسم کے کسی جرم کے صدور کا امکان تھا۔ بلکہ یہ بالواسطہ قریش کے ان زور آوروں کو تنبیہ ہے جن کو پچھلی سورتوں میں ان کے اسی قسم کے غصب حقوق پر سرزنش فرمائی گئی ہے لیکن وہ اپنے رویے کی اصلاح کے بجائے رسول کی مخالفت کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس سورہ میں ان کو نظرانداز کر کے رسولؐ کو ہدایت فرمائی کہ وہ جو روش بھی اختیار کریں ان کو ان کے حال پر چھوڑو، تمھیں بہرحال یتیموں کے حقوق کی حفاظت کرنی ہے۔

لفظ 'سائل' یہاں محدود معنی میں نہیں بلکہ وسیع معنی میں استعمال ہوا ہے۔ خواہ سائل اپنے پیٹ

اور تن کی کسی ضرورت کے تحت سوال کرے ' یا اپنی کسی ذہنی و عقلی الجھن سے متعلق سوال کرے ' یا اپنے دین سے متعلق سوال کرے ' غرض جس طرح کی بھی مدد و رہنمائی کا طالب ہو ' حتی الامکان اس کی مدد و رہنمائی کی جائے ' اور اگر اس کا موقع نہ ہو تو خوبصورتی کے ساتھ اس کے سامنے معذرت پیش کر دی جائے ' اس کو جھڑکا اور ڈانٹا نہ جائے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ بات یاد رکھنا کہ ایک دَور تم پر بھی ایسا گزرا ہے جب تم سراپا سوال تھے اور ان سوالوں نے تمھاری زندگی ضیق میں ڈال رکھی تھی ' بالآخر تمھارے رب نے تمھاری ہر خلش دُور فرمائی اور تمھارے ہر سوال کا جواب دیا۔ اس کا حق یہ ہے کہ تم بھی سائلوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا ' ان لوگوں کی رَوِش نہ اختیار کرنا جن کا حال یہ ہے کہ خدا نے ان کو دے رکھا ہے تو مسکینوں اور سائلوں سے ترش روئی سے پیش آتے ہیں اور اگر ابھی کسی گردش میں خدا ان کو پکڑ لے تو کہیں گے کہ خدا نے مجھے ذلیل کر دیا ' اس وقت ان کو یہ بات یاد نہیں آتی کہ انھوں نے خدا کے بندوں کو کس طرح ذلیل کیا ہے۔

نعمت سے صرف ' وہ غنا مراد نہیں ہے جو حضور ؐ کو حضرت خدیجہ ؓ کے مال سے حاصل ہوا ' بلکہ اصلاً اس سے دین کی وہ حکمت اور شریعت کی وہ دولت مراد ہے جس کی شان قرآن میں یہ بیان ہوئی ہے کہ وَمَنْ یُّؤْتَ الْحِکْمَةَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا کَثِیْرًا ' اور جس کو حکمت عطا ہوئی اس کو خیر کثیر کا خزانہ بخشا گیا (البقرۃ ۲:۲۶۹)۔ یہاں لفظ فحدث خاص طور پر نگاہ میں رکھیے۔ یہ مال کی نعمت کے لیے نہیں بلکہ حکمت کی نعمت ہی کے لیے موزوں ہے۔ فرمایا کہ جس حکمت کے خزانے سے تمھارے رب نے تم کو بہرہ ور کیا ہے اس کی تحدیث کرو۔ یعنی جس طرح تمھارے رب نے تمھیں مفت بخشا ہے ' تم بھی اس کو مفت بانٹو ' فیاضانہ بانٹو ' ہر آنے جانے والے کے سامنے اس کا چرچا کرو ' اور ہر بزم و انجمن کو اس کے ذکر سے معمور کر دو۔

تفہیم القرآن : سید ابوالاعلیٰ مودودی ؒ

یعنی تم چونکہ خود یتیم رہ چکے ہو ' اور اللہ نے تم پر یہ فضل فرمایا کہ یتیمی کی حالت میں بہترین طریقے سے تمھاری دستگیری کی ' اس لیے اس کا شکرانہ یہ ہے کہ تمھارے ہاتھ سے کبھی کسی یتیم پر ظلم اور زیادتی نہ ہونے پائے۔

اگر سائل کو مدد مانگنے والے حاجت مند کے معنی میں لیا جائے ' تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی مدد کر سکتے ہو تو کر دو ' نہ کر سکتے ہو تو نرمی کے ساتھ معذرت کر دو ' مگر بہرحال اسے جھڑکو نہیں۔ اس معنی کے لحاظ سے یہ ہدایت اللہ تعالیٰ کے اس احسان کے جواب میں ہے کہ "تم نادار تھے پھر اس نے تمھیں مالدار کر دیا"۔ اور اگر سائل کو پوچھنے والے ' یعنی دین کا کوئی مسئلہ یا حکم دریافت کرنے والے

کے معنی میں لیا جائے' تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسا شخص خواہ کیسا ہی جاہل اور اجڈ ہو' اور بظاہر خواہ کتنے ہی نامعقول طریقے سے سوال کرے یا اپنے ذہن کی الجھن پیش کرے' بہرحال شفقت کے ساتھ اسے جواب دو اور علم کا زعم رکھنے والے بدمزاج لوگوں کی طرح اسے جھڑک کر دور نہ بھگا دو۔ اس معنی کے لحاظ سے یہ ارشاد اللہ تعالیٰ کے اس احسان کے جواب میں ہے کہ "تم ناواقفِ راہ تھے پھر اس نے تمھیں ہدایت بخشی"۔ حضرت ابوالدرداء ؓ' حسن بصریؒ' سفیان ثوریؒ اور بعض دوسرے بزرگوں نے اسی دوسرے معنی کو ترجیح دی ہے کیونکہ ترتیب کلام کے لحاظ سے یہ ارشاد وَوَجَدَکَ ضَآلًّا فَھَدٰی کے جواب میں آتا ہے۔

نعمت کا لفظ عام ہے' جس سے مراد وہ نعمتیں بھی ہیں جو اس سورہ کے نزول کے وقت تک اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول پاک ؐ کو عطا فرمائی تھیں' اور وہ نعمتیں بھی جو بعد میں اس نے اپنے ان وعدوں کے مطابق آپ کو عطا کیں جو اس سورہ میں اس نے کیے تھے اور جن کو اس نے بدرجہ اتم پورا کیا۔

پھر حکم یہ ہے کہ اے نبی ؐ' ہر نعمت جو اللہ نے تم کو دی ہے اس کا ذکر اور اس کا اظہار کرو۔ اب یہ ظاہر بات ہے کہ نعمتوں کے ذکر و اظہار کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں اور ہر نعمت اپنی نوعیت کے لحاظ سے اظہار کی ایک خاص صورت چاہتی ہے۔

مجموعی طور پر تمام نعمتوں کے اظہار کی صورت یہ ہے کہ زبان سے اللہ کا شکر ادا کیا جائے' اور اس بات کا اقرار و اعتراف کیا جائے کہ جو نعمتیں بھی مجھے حاصل ہیں' یہ سب اللہ کا فضل و احسان ہیں' ورنہ کوئی چیز بھی میرے کسی ذاتی کمال کا نتیجہ نہیں ہے۔ نعمت نبوت کا اظہار اس طریقہ سے ہو سکتا ہے کہ دعوت و تبلیغ کا حق ادا کیا جائے۔ نعمت قرآن کے اظہار کی صورت یہ ہے کہ لوگوں میں زیادہ سے زیادہ اس کی اشاعت کی جائے اور اس کی تعلیمات لوگوں کے ذہن نشین کی جائیں۔ نعمتِ ہدایت کا اظہار اسی طرح ہو سکتا ہے کہ اللہ کی بھٹکی ہوئی مخلوق کو سیدھا راستہ بتایا جائے اور اس کام کی ساری تلخیوں اور ترشیوں کو صبر کے ساتھ برداشت کیا جائے۔ یتیمی میں دستگیری کا جو احسان اللہ تعالیٰ نے کیا ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ یتیموں کے ساتھ ویسے ہی احسان کا سلوک کیا جائے۔ نادار سے مال دار بنا دینے کا جو احسان اللہ نے کیا اس کا اظہار یہی صورت چاہتا ہے کہ اللہ کے محتاج بندوں کی مدد کی جائے۔ غرض یہ ایک بڑی جامع ہدایت تھی جو اللہ تعالیٰ نے اپنے انعامات و احسانات بیان کرنے کے بعد اس مختصر سے فقرے میں اپنے رسول مقبول ؐ کو دی۔ (اخذ و ترتیب: خرم مراد)

اعضا کی پیوند کاری

ایک مذاکرہ

ہر زمانہ اپنے ساتھ نئے مسائل لاتا ہے۔ ہمارے زمانہ میں اتنی تیزی کے ساتھ، اتنے بڑے پیمانہ پر اتنی بڑی بڑی اور دور رس تبدیلیاں آرہی ہیں کہ روز نئے نئے مسائل پیدا ہو رہے ہیں جو قرآن و سنت کی روشنی میں تشفی بخش حل کے طالب ہیں۔ اس مقصد کے لیے ضروری ہے کہ علمائے دین قرآن و سنت کو مدار بنا کر، اور سلف صالحین کی بیش بہا خدمات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، ان گوناگوں پیچیدہ مسائل کے حل کے لئے اجتماعی اجتہاد کی راہ اختیار کریں۔ بحث اور مذاکرہ میں اختلاف رائے ہمیشہ ہوا ہے، اور آج بھی ہوگا۔ لیکن اجتہاد کے علاوہ زمانہ کے تقاضوں کی حقیقی تکمیل اور پیش آمدہ مسائل کا صحیح حل ممکن نہیں۔ ہمیں خوشی ہے کہ بھارت میں ہر مسلک و فکر کے علما، اپریل ۱۹۸۹ سے، جدید مسائل پر بحث و نظر کے لیے فقہی سیمینار منعقد کر رہے ہیں۔ ہم پہلے سیمینار (منعقدہ ۳ اپریل ۱۹۸۹، بمقام دہلی) کی روداد میں سے "اعضا کی پیوند کاری" کے مسئلہ پر دو مقالات پیش کر رہے ہیں۔ مسئلہ اہم ہے، اگرچہ تہذیب نو کی تشکیل میں بنیادی اہمیت کا حامل نہیں، لیکن اختلاف اور استدلال کے طریقوں سے قارئین کے علم و فہم میں یقیناً قیمتی اضافہ ہوگا۔ (مدیر)

(۱)

مفتی محمد ظفیر الدین

مفتی دار العلوم دیوبند

زمانہ بڑی تیزی کے ساتھ رو بہ ترقی ہے، نئی ایجادوں نے انسانوں کو متحیر کر رکھا ہے، کل تک جس چیز کا تصور بھی مشکل تھا وہ حقیقت بن کر سامنے آرہی ہے۔ جدید تحقیقات و انکشافات سے آنکھیں بند کرنا بھی ممکن نہیں، اور ان سے کام نہ لینا بھی ناشکری ہوگی۔ البتہ یہ دیکھنا اور سمجھنا ہم مسلمانوں کے فرائض میں داخل ہے کہ جن چیزوں سے جس جس طرح کام لیا جاسکتا ہے، وہ کتاب و

سنت کے خلاف تو نہیں ہے' یا عہد صحابہ اور بعد کے ائمہ نے جو اصول و قواعد متعین کیے ہیں اس سے ٹکراتا تو نہیں ہے۔

نئی ایجادات سے اگر کتاب و سنت اور اقوال صحابہ کے دائرے میں رہ کر فائدہ حاصل کیا جا سکتا ہے تو ہمیں اس سے ضرور فائدہ اٹھانے کی جدوجہد کرنا چاہیے۔ مثال کے طور پر ٹیلی ویژن آج لہو و لعب میں استعمال ہوتا ہے' ہم اس کے لگانے اور دیکھنے کے ناجائز ہونے کا فتویٰ دیتے ہیں۔ لیکن کل اگر اس کا استعمال کتاب و سنت کے دائرے میں رہ کر ہو سکتا ہے ــــ مثلاً حدیث کا درس دیا جانے لگے' تفسیر بیان کی جائے اور وعظ و نصائح کے کام لیے جائیں ــــ تو جائز ہونے کا فتویٰ دینا ہو گا۔ ریڈیو سے خبریں اور تفسیر سننے کو جائز کہتے ہیں' اور مخرب اخلاق افسانے اور گانے سننے کو حرام لکھتے ہیں۔

یہی صورت حال اعضا کی پیوند کاری کی ہے۔ ناجائز چیز لگائی جائے تو اس کی اجازت شریعت نہیں دے گی۔ لیکن اگر جائز اشیا سے اعضا کی پیوند کاری کا کام لیا جائے تو پھر اسے ناجائز لکھنے اور کہنے کی کوئی وجہ نہیں۔ ایک صحابی کی ناک کٹ گئی تھی۔ انھوں نے چاندی کی ناک بنوا کر لگائی مگر وہ بھی راس نہ آئی' تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے سونے کی ناک بنوا کر لگائی' حالانکہ سونے کا استعمال مردوں کے لیے حرام قرار دیا گیا ہے (مشکوٰۃ باب الخاتم)۔

ہم عام طور پر مصنوعی دانت بنوا کر خود بھی لگاتے ہیں اور دوسرے مسلمانوں کو بھی اس کی اجازت دیتے ہیں' جو پاک مسالوں سے تیار ہوتے ہیں۔ اب تو معلوم ہوا ہے کہ انسانی جسم کے تقریباً تمام کار آمد اعضا مصنوعی بننے شروع ہو گئے ہیں' اور انھیں ہم استعمال کرتے ہیں۔

ترمذی شریف میں سونے کے تاروں سے دانتوں کے باندھنے کا ذکر کیا گیا ہے اور لکھا ہے: کئی اہل علم سے روایت ہے کہ انھوں نے دانت سونے سے باندھے۔ فقہ و فتاویٰ کی کتابوں میں مختلف مواقع میں سونے چاندی کے استعمال کی اجازت دی گئی ہے' اور بہت سارے مواقع میں اس کے استعمال سے روکا گیا ہے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ پہلی دوسری صدی ہجری میں ہی یہ سارے مسائل سامنے آ چکے تھے' اور امام ابو حنیفہؒ اور آپ کے تلامذہ بحث و مباحثہ کے بعد اپنی آرا لکھ چکے تھے۔

عالمگیری میں صریح جزئیہ ہے: امام محمد کہتے ہیں کہ ہڈیوں سے علاج کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے جبکہ ہڈی بکری' گائے' اونٹ' گھوڑا یا ان کے علاوہ دیگر جانوروں کی ہو' سوائے خنزیر اور آدمی کی ہڈی کے۔ ان سے علاج مکروہ (تحریمی) ہے' البتہ اس کی وضاحت کر دی گئی ہے کہ مذبوح جانور کی ہڈی

ہو جبکہ حیوان شرعی طریقہ سے ذبح کیا ہوا ہو' اس لیے کہ وہ ہڈی پاک ہے۔ تر ہو یا خشک' اس سے انتفاع جائز ہے۔

آگے ہے: حیوان مردار ہو تو اس کی ہڈی سے انتفاع جائز ہے اگر وہ خشک ہو' اور جائز نہیں اگر وہ تر ہو۔

شامی نے امام کرخی کا قول نقل کیا ہے: اگر کسی شخص کے سامنے کے دانت جھڑ جائیں تو وہ مذبوح بکری کے دانت اس کی جگہ لگا لے۔

معلوم ہوا جس طرح پاک مصنوعی اعضا کا استعمال شرعاً جائز ہے' مذبوح جانوروں کے اعضا کا استعمال بھی کیا جا سکتا ہے۔ شرعاً اس میں کوئی مضایقہ نہیں ہے۔

زندہ جانوروں کا کوئی حصہ البتہ کاٹ کر اعضا کی پیوند کاری میں استعمال کرنا جائز نہیں ہے کہ وہ مردار کے حکم میں ہے۔ حدیث نبوی ؐ ہے: زندہ جانور سے جو کاٹ لیا جائے' وہ مردار ہے (ترمذی)۔

بحث جو کچھ ہے وہ ایک انسان کے کسی عضو کا دوسرے انسان میں استعمال کرنے سے متعلق ہے۔ جہاں تک مسئلہ ہے خود اپنے کسی حصہ جسم کا دوسرے حصہ میں استعمال کرنے کا' اس میں کوئی اشکال نہیں ہوتا۔ جیسا کہ درمختار کا جزئیہ ہے: زندہ سے الگ ہونے والا جسم کا حصہ مردار ہوتا ہے مگر اس عضو والے کے حق میں نہیں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خود اپنے جسم میں مضایقہ نہیں ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اس طرح انسان صحت مند ہو جاتا ہے' اور اس میں نہ کوئی عیب پیدا ہوتا ہے اور نہ کبھی خریداری کی بات سامنے آتی ہے۔

ایک جسم کے خون کا استعمال دوسرے جسم میں جائز مانا گیا ہے اور اس کا فتویٰ بھی دیا جاتا ہے۔ اس کو اس جزئیہ سے لیا گیا ہے جس کے متعلق صراحت ہے: بیمار کے لیے خون اور پیشاب پینا جائز ہے' اگر مسلمان طبیب کہے کہ یہ شفا کے لیے ضروری ہے اور کوئی دوسری متبادل مباح دوا موجود نہیں۔ اگر طبیب کہے کہ اس سے جلد شفا ہو جائے گی' تو اس بارے میں دو رائے ہیں (عالمگیری)۔

حالانکہ خون بھی حرام اور پیشاب بھی۔ پیشاب کی حرمت ظاہر ہے' ساری کتابوں میں اس کی صراحت ہے۔ مگر مجبوری میں مسلمان طبیب جب یہ کہے کہ اس کے سوا دوسری دوا نہیں ہے تو مجبوری میں شرعاً اجازت ہوئی۔ یہاں اپنے خون یا پیشاب کی صراحت نہیں ہے۔ دونوں ہی مردار ہوتے ہیں' جس طرح فقہا نے عورت کے دودھ کو بطور دوا استعمال کی اجازت دی ہے' اس میں کوئی حرج نہیں

کہ مرد عورت کا دودھ بطور دوا پیے (عالمگیری)۔

اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ خنزیر کا تمام حصہ نجس عین ہے' اس لیے جائز نہیں۔ اور انسان کا بوجہ احترام آدمیت ناجائز قرار دیا گیا ہے۔

فقہ و فتاویٰ کی کتابوں میں انسانی اجزا کی خرید و فروخت کو انسانی عظمت کے پیش نظر عام طور پر ناجائز و حرام قرار دیا گیا ہے' خواہ وہ زندہ انسان کا حصہ ہو یا مرنے والے کا: انسان اپنی موت کے بعد بھی ویسا ہی قابل احترام ہے جس طرح اپنی زندگی میں تھا۔ پس جس طرح زندہ انسان کے جزء سے اگر اُسے دوا کرنا جائز نہیں ہے' ایسے ہی مردہ کی ہڈی سے علاج جائز نہیں ہے (شرح السیر الکبیر)۔

مضطر جس کے لیے مردار تک کھانے کی مخمصہ میں اجازت دی گئی ہے' اس شخص کے متعلق فقہا لکھتے ہیں: کوئی مضطر اگر میتہ نہ پائے' اور اسے اپنی ہلاکت نفس کا خوف ہو' ایسی حالت میں اگر کوئی شخص اس سے کہے کہ میرے ہاتھ کاٹ لو اور کھا لو' یا یہ کہے کہ ایک حصہ کاٹ کر کھا لو' تو مضطر کے لیے ایسا کرنا جائز نہیں ہو گا' اور نہ یہ حکم دینا صحیح ہو گا' اور نہ مضطر کے لیے یہ درست ہو گا کہ وہ اپنے ہی جسم کا کوئی حصہ کاٹ کر کھا لے (عالمگیری)۔

فقہا نے یہ بھی لکھا ہے کہ اگر کسی کو دھمکی دی جائے کہ فلاں کو قتل کر دو ورنہ تم کو قتل کر دیا جائے گا' تو کیا اس کے لیے جائز ہو گا کہ اس کو قتل کر ڈالے اور اپنی جان بچا لے؟ فقہا لکھتے ہیں' ایسا کرنا جائز نہ ہو گا۔ اس سلسلہ میں فقہا کے پیش نظر کتاب و سنت کی یہ تصریحات ہیں: ہم نے بنی آدم کو مکرم بنایا (بنی اسرائیل)۔ مردہ کی ہڈی توڑنا ایسا ہی ہے جیسے زندہ کی ہڈی توڑنا (موطا)۔ مومن کو مردہ حالت میں ایذا دینا اس کی زندگی میں ایذا دینے کی طرح ہے (مصنف ابن ابی شیبہ کتاب الجنائز)۔

ایک بڑی وجہ اس سلسلہ میں یہ بھی ہے کہ انسانی اعضا' جو اس کے پاس بطور امانت ہیں' اس کو حکم الٰہی کے خلاف ناجائز میں استعمال کی جرات کر رہا ہے۔ اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ اس کے جواز کے فتویٰ کے بعد انسانی عظمت خاک میں مل کر رہ جائے گی' اور انسانی اعضا کی بیع و شرا شروع ہو جائے گی۔ خود انسان بھی پیٹ بھرنے' بچوں کے فاقہ اور شراب وغیرہ کی لت کی وجہ سے اپنے اعضا فروخت کرنا شروع کر دے گا۔

دوسری طرف آخرت پر جن کا عقیدہ نہیں ہے' یا ہے مگر روپے کی خاطر سارے ناجائز کو اپنے لیے جائز کر لیتے ہیں' وہ انسانوں کا اغوا کر کے اعضا انسانی کی تجارت شروع کر دیں گے' اور حکومت وقت کا کوئی قانون اس کو بچا نہیں سکے گا' خواہ وہ قانون کتنا ہی سخت اور مضبوط کیوں نہ ہو۔ غریب اور کمزور انسان کا جینا مشکل ہو جائے گا اور سرمایہ دار اور قوی گھرانے غریبوں اور کمزوروں پر عرصہ

حیات تنگ کر دیں گے۔ پہلے زمانہ میں غلامی کے مسئلہ پر اعتراض کیا کرتے تھے۔ یہ مسئلہ غلامی سے بھی بد تر ہو جائے گا' اور انسان صحیح معنی میں انسان باقی نہ رہ جائے گا۔

جو حضرات ایک انسان کے اعضا کی دوسرے انسان میں پیوند کاری کو جائز کہتے ہیں' وہ کتاب و سنت اور فقہ و فتاویٰ کی کھلی مخالفت کرتے ہیں۔ یہ کہنا کہ حکم 'عمل پر نہیں ارادہ اور نیت پر ہوتا ہے' میرے نزدیک قطعاً صحیح نہیں۔ اس طرح کے مسائل کا حکم ظاہر پر ہوتا ہے' ارادہ و نیت پر نہیں ہوتا کہ یہ دیکھنے کی چیز نہیں۔ یہ کیسی دانشمندی ہوگی کہ ایک انسان کی صحت یابی کے لیے دوسرے کی صحت سے کھیلا جائے اور مستقبل میں اس کو بیماری کا لقمہ تر بنایا جائے۔ امورِ آخرت میں باطن کو دیکھا جاسکتا ہے اور دیکھا جاتا ہے' لیکن امورِ دنیا میں ظاہر ہی پر حکم لگایا جائے گا۔

آدم علیہ السلام سے اب تک دنیا پر ہزاروں سال گزر چکے' انسان اپنی ضرورتیں پوری کرتا رہا' اس ظلم اور جور و تعدی کا تصور تک انسانی ذہن میں نہیں آیا' یہ ظلم خواہ اپنے اوپر ہو یا غیر کے اوپر۔ ایک شخص تو تکلیف میں ہے ہی' دوسرے کو بھی تکلیف میں بھی مبتلا کرنے کا راستہ کھولا جارہا ہے۔

یہ کہنا کہ عورت کے پیٹ کو چاک کرنے کی فقہا نے بعض اوقات اجازت دی ہے' تشریح یہ ہے کہ جب تک بچہ عورت کے پیٹ میں ہے' زندہ یا مردہ' اس کا جزو بدن ہے' علیحدہ نہیں' دونوں ایک کے حکم میں ہیں' الگ الگ نہیں۔ لہٰذا اس مسئلہ خاص کو اس پر قیاس کرنا قطعاً صحیح نہیں ہے۔ پوسٹ مارٹم کوئی شرعی مسئلہ نہیں ہے کہ درمیان میں اس کو لاکر غلط فہمی پیدا کی جائے اور اس پر قیاس کیا جائے۔

اس کو ایثار کا نام دینا بھی نفس کا کھلا فریب ہے۔ راحت سے محروم کے لیے زندہ اور مردہ انسان کے اعضا کا بخشنا تو ایثار ہے' مگر کیا محروم الراحت شخص پر یہ فرض نہیں ہے کہ وہ زندہ اور مردہ انسان پر رحم کھائے اور اس کے احترام آدمیت کی لاج رکھے۔ یہ یک طرفہ فیصلہ حیرت انگیز ہے۔

جن فقہا نے ایک مضطر کو زندہ انسان کے گوشت کھانے یا مردہ انسان کے کھانے کی اجازت دی ہے' ان کی یہ ہمدردی ہرگز قابل توجہ نہیں ہے۔ ان کی یہ ہمدردی یک طرفہ ہے۔ انسانیت کے احترام کا تقاضا یہ تھا کہ سب پر نظر رکھی جاتی۔ کسی زندہ و صحت مند کو دوسرے بیمار زندہ کا لقمہ تر بنانا یا احترام انسانیت پر قلم پھیر دینا ہرگز مناسب نہیں۔

جس حکومت کا قانون خون ریزی' آتش زنی اور لوٹ مار کو بند نہیں کر سکتا' اس کے قانون سے اس کی توقع رکھنا کہ اجازت کا بے جا استعمال نہ ہو گا عقل میں آنے کی بات نہیں۔ وہ منظر کس قدر بھیانک ہو گا کہ ادھر مرنے والے کی روح نے پرواز کیا' اور وہیں ہاتھوں ہاتھ پہلے سے تیار ڈاکٹر اس

مردہ کی آنکھیں نکالیں گے' پیٹ چاک کر کے گردے باہر کر دیں گے' اور بہت سے کمزور و غریب کے جسم کے ٹھنڈا ہونے کا انتظار کیے بغیر اپنے آلات کا استعمال شروع کر دیں گے۔

ان لوگوں کی عقل و فہم پر حیرت ہے جو اعضا کے عطیہ اور ہبہ کو بال کٹنے' ختنہ کرنے یا زخم یا آپریشن کے چیر پھاڑ پر قیاس کرتے ہیں۔ اس باب میں علما احناف کے فہم و فراست کی داد دینی پڑتی ہے کہ انھوں نے ہر ہر قدم پر نصوص اور انسانی احترام کو ملحوظ رکھا ہے۔

(۲)

خالد سیف اللہ رحمانی

صدر مدرس دار العلوم سبیل السلام، حیدر آباد

۱۔ انسانی جسم میں از راہ علاج جمادات یا 'انسان کے علاوہ دوسرے حیوانات' کے اعضا کی پیوند کاری کے جواز میں کوئی کلام نہیں۔

اس میں گو اختلاف ہے کہ انسان خود اپنے جسم کے حصہ کی دوبارہ اپنے جسم میں پیوند کاری کر سکتا ہے یا نہیں؟ طرفین اس کو جائز نہیں سمجھتے' اس لیے کہ جسم کا جو حصہ جسم سے کٹ گیا ہے اب اس کو دفن کیا جانا واجب ہے۔ اس کے دوبارہ استعمال میں اس سے انحراف پایا جاتا ہے۔ "پس جب کہ کوئی جز بدن سے جدا ہو گیا تو وہ مستحق دفن ہو گیا جیسے کل بدن اور اس جز کو دوبارہ استعمال کرنا اس کو اس کے استحقاق سے روکتا ہے"۔ امام ابو یوسف" کے نزدیک یہ جائز ہے' کیوں کہ انسان کا خود اپنے جز سے انتفاع از قبیل اہانت نہیں ہے: "اپنے جز کے استعمال میں اس کی توہین نہیں ہے" (بدائع الصنائع ۵: ۱۳۲)۔

لیکن اس باب میں بھی فتویٰ ابو یوسف ہی کی رائے پر ہے' اور عام طور پر فقہا نے اس کو جائز ہی رکھا ہے۔

۲۔ اصل مسئلہ ایک انسان کے اعضا کی دوسرے انسان کے جسم میں پیوند کاری کا ہے۔ جن حضرات نے اعضا کی پیوند کاری کو ضرورتاً جائز قرار دیا ہے' ان کے پیش نظر وہ فقہی قواعد ہیں جن کے مطابق "ضرورت" کی وجہ سے ناجائز چیزیں جائز قرار پاتی ہیں (الضرورات تبیح المحذورات)۔ یا مشقت پیدا ہو جائے تو یسر و آسانی کی راہ اختیار کی جاتی ہے (المشقة تجلب التیسیر)۔ اور اس سلسلہ میں پیشِ نظر قرآن مجید کی وہ آیات ہیں جن میں جان بچانے کے لیے حالتِ اضطرار میں حرام چیزوں کے کھانے یا حالت اکراہ میں کلمۂ کفر زبان سے ادا کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔

۳۔ جن لوگوں نے اعضا کی پیوند کاری سے منع کیا ہے' انھوں نے اس کے مختلف اسباب بیان کیے ہیں۔ انسان کے علیحدہ شدہ اعضا کا ناپاک ہونا اور حرام ہونا۔ انسان کا خود اپنے جسم کا مالک نہ ہونا اور اللہ کی طرف سے اپنے وجود کا امین ہونا۔ لیکن خود فقہا متقدمین نے مختلف جزئیات میں ' انسانی ضرورت کی رعایت کرتے ہوئے' ان تمام امور کی اباحت کو قبول کیا ہے' ناپاک و حرام اشیا سے علاج کی اجازت بھی دی ہے' اور اپنے جسم میں ایسے تصرف کی اجازت بھی دی ہے جو کسی نص صریح سے متعارض نہ ہو۔

اصل علت جو مانعین کے پیشِ نظر ہے وہ انسانی حرمت و کرامت کا تحفظ ہے۔ اکثر فقہا نے انسانی اجزا سے انتفاع کو اسی لیے منع کیا ہے' کہ انسان متاعِ خرید و فروخت بن جائے۔ یہ اس کی شانِ تکریم کے خلاف ہے۔ کتب فقہ میں کثرت سے ایسی عبارتیں موجود ہیں' بطور نمونہ نقل کی جاتی ہیں: "انسان کے بال سے نہ انتفاع جائز ہے نہ اس کی بیع جائز ہے' اس لیے کہ آدمی مکرم ہے نہ کہ قابلِ صرف کوئی چیز۔ پس نہیں جائز ہے کہ اس کے اجزا میں سے کسی بھی جز کو ذلیل کیا جائے اور استعمال کیا جائے" (البحر الرائق ۶/۸۱)۔

"بے شک آدمی کا بال اس کی کرامت کی وجہ سے قابلِ انتفاع نہیں ہے" (المبسوط ۱۵/۱۲۵)۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ آدمی کے اجزا سے انتفاع نجاست کی بنا پر جائز نہیں۔ دوسرا قول یہ ہے کہ یہ اس کی کرامت کی وجہ سے ہے' اور یہی صحیح ہے۔ (ہندیہ ۵/ ۳۵۴)

اور چوں کہ حرمت و کرامت میں زندہ و مردہ دونوں مساوی ہیں' اس لیے زندہ انسان کے اعضا اس مقصد کے لیے استعمال کیے جاسکتے ہیں نہ مردہ کے۔ اس سلسلہ میں سب سے واضح روایت وہ حدیث ہے کہ "مردہ کی ہڈی کو توڑنا ایسا ہی ہے جیسے زندگی میں اس شخص کی ہڈی کو توڑ دینا"۔

۴۔ اس مسئلہ میں دو باتیں قابلِ غور ہیں:

اول یہ کہ کیا موجودہ زمانہ میں پیوند کاری کا طریقہ بھی "اہانتِ انسان" میں داخل ہے؟

دوم یہ کہ انسانی جان کے تحفظ کے لیے اہانت محترم کو گوارا کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟

۵۔ پیوند کاری کے اہانت انسان ہونے کے سلسلہ میں یہ بات قابلِ لحاظ ہے کہ شارع نے انسان کو مکرم و محترم تو ضرور قرار دیا ہے' اور یہ اس بات کی علامت ہے کہ وہ اس کی توہین کو جائز نہیں رکھتا' لیکن کتاب و سنت نے تکریم و اہانت کے سلسلہ میں کوئی بے لچک حدود مقرر نہیں کی ہیں۔ اور اہلِ علم کی نظر سے یہ امر مخفی نہیں کہ نصوص نے جن امور کو مبہم رکھا ہو اور قطعی فیصلہ نہ کیا ہو' انسانی عرف و

عادت ہی سے اس کی توضیح ہوتی ہے ' ڈاکٹر وہبتہ الزحیلی نے مختلف فقہا کے نقطہ نظر پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے: فقہا نے کہا ہے کہ جو چیز شریعت میں مطلقاً وارد ہوئی ہے ' اور اس کے لیے شریعت میں نہ کوئی ضابطہ ہے نہ لغت میں ' تو اس میں عرف کی طرف ہی رجوع کیا جائے گا ' جیسے کہ سرقہ میں حفاظت (اصول الفقہ الاسلامی ۲/ ۸۳۱)

۶- پھر اس امر میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ عرف و عادت کی بعض صورتیں زمانہ و علاقہ کی تبدیلی سے بدلتی رہتی ہیں ' اور ایک ہی معاملہ میں علاقہ و وقت کی تبدیلی کی وجہ سے دو مختلف حکم لگائے جاتے ہیں 'کبھی اس کو بہتر اور درست سمجھا جاتا ہے اور کبھی اس کو قبیح و نادرست - امام ابو اسحاق شاطبی فرماتے ہیں: بعض چیزیں حسن سے قبح کی طرف مبتدل ہوتی ہیں اور بعض اس کے برعکس ' جیسے سر کا کھولنا مشرقی ممالک میں قبیح ہے مگر مغربی ممالک میں قبیح نہیں ہے - اسی اختلاف کی وجہ سے حکم شرعی مختلف ہو جائے گا ' چنانچہ اہل مشرق کے نزدیک سر کا کھولنا عدالت کے لیے نقصان دہ ہو گا اور اہل مغرب کے نزدیک نقصان دہ نہیں ہو گا (الموافقات ۲/ ۲۰۹ ' ۲۱۰)-

پس جب اہانت و اکرام کے متعلق شریعت نے کوئی متعین اصول وضع نہیں کیے ہیں تو ضرور ہے کہ ہر زمانہ کے عرف و عادت ہی کی روشنی میں کسی بات کے باعث توہین ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ کیا جائے اور عین ممکن ہے کہ ایک ہی چیز جو کسی زمانہ میں توہین شمار ہوتی ہو 'بعد کے زمانے میں اس کا شمار توہین میں نہ ہو - فقہا نے اجزا انسانی سے انتفاع کو بے شک منع کیا ہے 'لیکن یہ ممانعت اس لیے تھی کہ اس زمانے میں انسانی اعضا سے انتفاع کو اس کی توہین تصور کیا جاتا تھا اور اس دور میں ایسے طریقے بھی رائج نہیں ہوئے تھے کہ شائستہ طور پر انسانی اجزا سے انتفاع کیا جا سکے - ہمارے زمانے میں اس عمل کو انسان کی توہین نہیں سمجھا جاتا - اگر کوئی شخص اپنا عضو کسی اور کو دے دے ' تو نہ وہ خود اپنی اہانت کا احساس کرتا ہے نہ لوگ ایسا محسوس کرتے ہیں 'بلکہ اس کی قدر و منزلت میں اضافہ ہو جاتا ہے - اسی لیے بڑے بڑے قائدین اور زعما اپنے اعضا کے سلسلہ میں اس قسم کی وصیت کر جاتے ہیں ' اور یہ چیز ان کے لیے نیک نامی کا باعث ہوتی ہے اور انسانیت نوازی کی دلیل سمجھی جاتی ہے - ایک انسان کے جسم کا خون دوسرے انسان کے جسم میں منتقل کیا جا سکتا ہے ' اب اس پر قریب قریب اتفاق ہو چکا ہے ' حالاں کہ جز انسانی سے انتفاع کو مطلقاً "توہین انسانی" باور کیا جائے تو اسے بھی ناجائز ہونا چاہیے 'کہ جز انسانی ہونے میں دونوں کی حیثیت یکساں ہے - اس میں شبہ نہیں کہ بعض بزرگوں نے خون اور کسی اور عضو میں انتفاع میں فرق کیا ہے اور خون کو دودھ پر قیاس کیا ہے مگر استدلال محل نظر ہے 'کیوں کہ دودھ انسانی جسم میں رکھا ہی اس لیے گیا ہے کہ وہ جسم سے خارج ہو اور اس کا استعمال ہو ' اس کا

استعمال نہ کیا جانا صحت انسانی کے لیے مضر ہے جب کہ خون قوام حیات ہے' اور اس کو جسم میں باقی رکھنے پر ہی حیات انسانی موقوف ہے۔ اس لیے خون دودھ کی نہیں بلکہ دوسرے ٹھوس اور سیال اجزائے انسانی کی نظیر ہے۔

مفتی کفایت اللہ صاحب ؒ گو اعضا کی پیوند کاری کو درست نہیں سمجھتے' تاہم وہ بھی مطلقاً اجزا سے انتفاع کو حرام نہیں کہتے ہیں' اور اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ کبھی اجزائے انسانی کا استعمال ایسا بھی ہو سکتا ہے جو مستلزم اہانت نہ ہو۔ مفتی صاحب ؒ کا بیان ہے کہ "یہ شبہ کہ انسان کے اجزا کا استعمال ناجائز ہے' اس لیے وارد نہ ہونا چاہیے کہ استعمال کی جو صورت کہ مستلزم اہانت ہو وہ ناجائز ہے' اور جس میں اہانت نہ ہو تو ضرورتاً وہ استعمال ناجائز نہیں" (کفایۃ المفتی ۹ / ۳ / ۱۴۳)۔ پس چوں کہ موجودہ زمانہ میں اجزائے انسانی سے انتفاع کے ایسے طریقے ایجاد ہو گئے ہیں جو مستلزم اہانت نہیں ہیں اور نہ عرف میں ان کو اہانت سمجھا جاتا ہے' اس لیے اصولی طور پر ان کو درست اور جائز ہونا چاہیے۔

۸۔ دوسرے فقہی نظائر کو سامنے رکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانی جان کے تحفظ اور بقا کے لیے قابل احترام چیزوں کی اہانت بھی قبول کی جا سکتی ہے۔ قرآن مجید کی حرمت انسانی اعضا کی حرمت سے زیادہ صراحت کے ساتھ حدیث سے ثابت ہے' یہاں تک کہ بے وضو قرآن مجید کو چھونا اور حالت جنابت میں پڑھنا بھی جائز نہیں۔ لیکن فقہا نے از راہ علاج' خون اور پیشاب سے بھی آیات قرآنی کو لکھنے کی اجازت دی ہے: جس شخص کو نکسیر ہو اور خون بند نہ ہوتا ہو' وہ اگر اپنے خون سے اپنی پیشانی پر قرآن کا کوئی حصہ لکھنا چاہے تو ابوبکر کہتے ہیں کہ جائز ہے۔ ان سے سوال کیا گیا اگر پیشاب سے لکھے' تو کہا اگر اس سے شفا ہوتی ہو تو کوئی حرج نہیں' ان سے سوال کیا گیا اگر مردار کے چمڑے پر لکھے' تو کہا اگر شفا ہوتی ہو تو جائز ہے (خلاصۃ الفتاوٰی ۴ / ۳۶۱)۔

علامہ سمرقندی نے ایک خاص جزئیہ پر بحث کرتے ہوئے جس اصول سے استدلال کیا ہے وہ یہی ہے کہ ایک انسان کی بقا کے لیے دوسرے کی تکریم کے پہلو کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ فرماتے ہیں: اگر کوئی حاملہ مر جائے اور اس کے پیٹ میں بچہ ہو جو حرکت کرتا ہو' اگر غالب ظن یہ ہو کہ وہ بچہ زندہ ہے اور اتنی مدت کا ہے جس میں عام طور پر بچہ زندہ رہ جاتا ہے' تو اس حاملہ کے پیٹ کو چاک کیا جائے گا۔ اس لیے کہ اس میں ایک انسان کو زندگی بخشنا ہے' اور کسی زندہ کی موت کا سبب بننے کے مقابلے میں زیادہ آسان ہے کہ آدمی کی عظمت کے تقاضے کو چھوڑ دیا جائے (تحفۃ الفقہا ۳ / ۳۴۳)

ماں کی موت ہو جائے اور آثار بتاتے ہوں کہ جنین زندہ ہے' تو فقہا نے عورت کے آپریشن کی اجازت دی ہے' اور استدلال یہ کیا ہے کہ یہاں تعظیم میت کو ایک زندہ نفس کی بقا کے لیے ترک کیا جا

رہا ہے۔ لان ذالک تسبب فی احیاء نفس محترمۃ بترک تعظیم المیت (البحر الرائق ۸/۵/۲۰۵)۔ اسی اصول سے یہ مسئلہ بھی متعلق ہے کہ مضطر کسی مردہ انسان کو اپنی جان بچانے کے لیے کھا سکتا ہے یا نہیں؟ مالکیہ اور حنابلہ کی رائے ہے کہ نہیں کھا سکتا' شوافع اور بعض احناف کے یہاں کھا سکتا ہے' اس لیے کہ زندہ کی حرمت مردہ سے بڑھ کر ہے۔ وقال الشافعی وبعض الحنفیۃ یباح وھو اولی لان حرمۃ الحی اعظم (المغنی ۹/۳۳۵)۔ فقہا حنابلہ میں ابو الخطاب نے بھی یہی رائے اختیار کی ہے۔

امام قرطبی لکھتے ہیں: "جب کوئی شخص اضطراری حالت میں ہو' اور وہ مردار' خنزیر اور آدمی کا گوشت پائے تو (ان میں سے) مردار کو کھائے گا' اس لیے کہ وہ بعض موقع پر حلال ہو جاتا ہے' بخلاف خنزیر اور آدمی کے جو کسی حال میں حلال نہیں ہے' نہ انسان کے لیے اس کا کھانا جائز ہے چاہے وہ مرجائے۔ یہ ہمارے علما کا قول ہے' اور یہی قول امام احمد اور داؤد کا ہے..... امام شافعی آدمی کے گوشت کھانے کو جائز کہتے ہیں (الجامع لاحکام القرآن ۲/۲۲۹)۔

مشہور مالکی فقیہ ابن عربی نے بھی اس مسئلہ میں شوافع ہی کی رائے اختیار کی ہے کہ اگر اس سے بچ جانے کی امید ہے تو کھالے۔ الصحیح عندی ان لا یاکل الادمی الا اذا تحقق ان ذالک ینجیہ ویحییہ (الجامع لاحکام القرآن ۲/۲۲۹)۔ اسی طرح اگر کوئی ایسا شخص مضطر کو مل جائے جس کا خون کسی جرم کی وجہ سے جائز ہے تو اس کو قتل کر کے اس کا گوشت کھا کر اپنی زندگی کا تحفظ بھی جائز ہے۔ (المغنی ۹/۳۳۵ قرطبی ۲/۲۲۹)۔ اور ناقلین نے تو یہاں تک نقل کر دیا ہے کہ امام شافعیؒ نے جان بچانے کے لیے انبیاے کرام کا گوشت کھانے کی اجازت دی ہے۔ اباح الشافعی اکل لحوم الانبیاء (ایضا)۔ معلوم ہوتا ہے کہ چوں کہ اس پر اہل علم نے گرفت کی' اس لیے بعد کو فقہائے شوافع نے انبیا کی میت کو اس حکم سے مستثنٰی قرار دے دیا' ابن نجیم لکھتے ہیں: انھوں نے کہا کہ اس سے نبی کی نعش مستثنٰی ہے' اس کا کھانا مضطر کے لیے جائز نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شارع کے نزدیک انبیا کی نعش کی حرمت مضطر کی روح سے بڑھی ہوئی ہے (الاشباہ و النظائر، ص ۸۴)۔

۹۔ زندہ انسانوں کے عضو کی منتقلی میں البتہ یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ فقہا نے مکرہ کے لیے اس کو جائز قرار نہیں دیا ہے کہ وہ کسی شخص کی اجازت سے بھی اس کے جسم سے کچھ حصہ کاٹ کھائے۔ علامہ کاسانی لکھتے ہیں: بہرحال وہ فرع جو مباح نہیں ہے' اور نہ اکراہ کی وجہ سے اس میں کسی بھی صورت میں رخصت دی جاتی ہے' تو وہ فرع ناحق کسی مسلمان کو قتل کرنا ہے' چاہے اکراہ ناقص ہو یا تام' اور ایسے ہی انسان کے اعضا میں سے کسی عضو کا کاٹنا' اگرچہ مکرہ علیہ اسے اجازت دیتے ہوئے کہہ دے کہ کاٹ لو' تو کاٹنا اس کے لیے جائز نہیں ہو گا (بدائع الصنائع ۷/۱۷۷)۔

اس لیے اگر مرنے والے کے اعضا کی پیوند کاری کو جائز بھی قرار دیا جائے تو بھی اس کو جائز نہیں ہونا چاہیے کہ زندہ شخص کا عضو دوسرے شخص کو منتقل کیا جائے' گو وہ خود اس پر رضامند ہو۔ لیکن ضروری ہے کہ فقہا کی اس طرح کی تعبیر کو ہم اس زمانے میں موجودہ زمانے کی تحقیق اور انکشاف کے تناظر میں دیکھیں۔ پیوند کاری کے طریقہ میں ہلاکت یا ضرر شدید کا اندیشہ نہیں' اور کسی کے جسم سے گوشت کاٹ کھانے میں ہلاکت یا ضرر شدید کا قوی اندیشہ ہے۔ مثلاً اپنے اعضا سے خود انتفاع درست ہے' لیکن بعض فقہا نے مضطر کے لیے خود اپنے جسم کے کسی حصہ سے گوشت کھانے کو بھی منع کیا ہے۔ کما لا یسع للمضطر ان یقطع قطعۃ من نفسہ فیاکل (قاضی خان علی الھندیہ ۴۔ ۴)۔ ابن قدامہ نے اس کی وجہ پر ان الفاظ میں روشنی ڈالی ہے: اور ہماری دلیل یہ ہے کہ انسان کا اپنے جسم میں سے کسی حصہ کو کھا لینا بسا اوقات اس کی موت کا سبب ہو گا۔ اس طرح وہ خود اپنا قاتل ہو جائے گا' اور نہ اس کے کھانے سے اس کا زندہ رہنا یقینی ہے۔ (المغنی، ۹/۵ ۲۲)۔

پس اب یہ بات منقح ہو گئی کہ زندہ انسان کے عضو کی اس طرح منتقلی کہ وہ اس کی ہلاکت یا اس کے لیے ضرر شدید کا باعث بنے' درست نہیں۔ البتہ وہ اعضا کہ جن کی منتقلی سے اس کی ہلاکت کا اندیشہ نہ ہو اور محفوظ طریقہ پر اس عمل کو انجام دیا جائے' اور خود وہ شخص ایسا کرنے پر رضامند بھی ہو' تو اس کو درست ہونا چاہیے۔

۱۰۔ رہ گئیں بعض نصوص' مثلاً لعن اللہ الواصلۃ والمستوصلۃ (اللہ نے لعنت بھیجی ہے اپنے بالوں میں دوسرے بال داخل کرنے والی پر اور کروانے والی پر)۔ تو اس میں اجزائے انسانی سے ایسے انتفاع کو منع کیا گیا ہے جو انسان کے لیے ضرورت کا درجہ نہ رکھتا ہو بلکہ محض تزئین و آرائش کے جذبات کی تسکین اس سے مقصود ہو۔ اسی طرح وہ حدیث کسر عظم المیت ککسر عظم الحی (مردہ کی ہڈی کو توڑنا زندہ کی ہڈی توڑنے کی طرح ہے) عام حالات پر محمول ہے جب کہ کوئی انسانی ضرورت اس سے متعلق نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ فقہا نے نہ صرف جنین کی حفاظت کے لیے مردہ ماں کے آپریشن کی اجازت دی ہے' بلکہ اگر کسی شخص نے کسی کا موتی نگل لیا ہو اور اس کی موت واقع ہو گئی تو بعض حالات میں اس دوسرے شخص کے ایک حق مالی کے تحفظ کے لیے بھی مردہ کی چیر پھاڑ اور اس کے پیٹ سے موتی نکالنے کو فقہا نے جائز رکھا ہے (البحر الرائق ۸/۵ ۲۰)۔ دوسرے اہل فن کے نزدیک یہ روایت ضعیف بھی ہے۔ اس کے سلسلہ سند میں ایک راوی سعد بن سعید انصاری ہیں جن کے بارے میں ابن حزم کی یہ رائے ہے کہ وہ بہت ضعیف ہیں' اور اس میں اختلاف نہیں کہ ان سے دلیل نہیں لائی جا سکتی۔ اس لیے حقیقت یہ ہے کہ اجزائے انسانی سے انتفاع کی حرمت پر کوئی صریح اور غیر محتمل نص

موجود نہیں ہے۔

۱۱۔ اس مسئلے میں مسلمان اور کافر کے اعضا میں 'استحباب کے درجہ میں تفریق ہو تو درست ہے۔ یعنی بہتر ہے کہ ایک مسلمان کے جسم میں دوسرے مسلمان کے عضو کی پیوند کاری ہو۔ مگر اس کو شرط کا درجہ دینا درست نظر نہیں آتا۔ ابھی گزر چکا ہے کہ فقہا نے مضطر کو ایسے شخص کے کھانے کی اجازت دی ہے جو مباح الدم ہو گیا ہو۔ بعض فقہا نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ کافر حربی کو کھانا بھی اسی حکم میں ہے۔

دودھ پلانے والی عورت کے متعلق سرخسی کا بیان ہے: اس میں کوئی حرج نہیں کہ کوئی مسلم کسی دودھ پلانے والی کافر عورت کو اجرت پر رکھے 'یا ایسی عورت کو جو فاجر ہو 'کیوں کہ کفر کی خباثت اس کے اعتقاد میں ہوتی ہے ' دودھ میں نہیں۔ انبیائے کرام و رسل عظام علیہم الصلوۃ والتسلیم میں بعض ایسے ہیں جنھوں نے کافر عورتوں کا دودھ پیا ہے۔ اسی طرح فاجرہ کے فسق و فجور کا اثر اس کے دودھ میں نہیں ہوتا ہے (المبسوط ۱۵/۱۲۷)۔ ابن رشد مالکی نے شریف عورت کے دودھ پلانے کو بہتر قرار دیا ہے 'تاہم کافر عورت کا دودھ پلانا بھی جائز ہے 'اگر اس کا خطرہ نہ ہو کہ وہ بچے کو حرام کی چیزیں کھلائیں گی یا پلائیں گی۔ دودھ پلانے کے لیے یہودی و نصرانی عورتوں کو رکھنا مکروہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس امر کا اندیشہ رہتا ہے کہ وہ بچوں کو حرام غذا کھلائیں گے 'اور شراب پلائیں گی۔ ابن حبیب امام مالک سے نقل کرتے ہیں کہ جب اس امر کا اندیشہ نہ ہو تو کوئی حرج نہیں۔ (مقدمات ابن رشد مع مدونة الکبری، ۲/۱۷)۔

پس جب دودھ کے مسئلے میں اس توسع کو گوارا کیا جا سکتا ہے تو ایسے مواقع پر جہاں انسان طبی اعتبار سے اضطرار کے درجہ کو پہنچ گیا ہو 'بدرجہ اولیٰ کافر کے اعضا کی پیوند کاری کو درست ہونا چاہیے۔

۱۲۔ جہاں تک اعضا کے خرید و فروخت کی بات ہے شریعت نے بعض مواقع پر انسانی وجود اور انسانی اعضا کو متقوم (قابلِ قیمت) مانا ہے 'اور یہ اس وقت ہے جب کوئی انسان ہلاک کر دیا جائے یا اس کا کوئی عضو تلف کر دیا جائے۔ اس کو اصطلاح شرع میں دیت کہتے ہیں۔ اس پر بھی اتفاق ہے کہ آزاد انسان کے پورے وجود کی خرید و فروخت نہیں ہو سکتی۔ انسانی جسم کے مختلف اجزا میں بال اور دودھ یہی دو چیزیں تھیں جن سے گزشتہ زمانہ میں انتفاع کیا جاتا تھا۔ بال کا استعمال عموماً آرائش و زیبائش کے لیے کیا جاتا تھا۔ فقہا نے اس کی خرید و فروخت کو بھی منع کیا ہے اور وجہ یہی قرار دی ہے کہ یہ انسانی حرمت و کرامت کے مغایر ہے۔ یعنی انسانی بال کی فروختگی اور اس سے نفع اٹھانا جائز نہیں ہے 'کیوں کہ آدمی شرعاً مکرم ہے مبتذل نہیں۔ پس اجزائے انسانی کے کسی جز کو مبتذل و بے وقعت

کرنا جائز نہیں ہے (البحر الرائق ۸/۶، نیز ھندیہ ۱/ ۱۱۴/۳)۔ علامہ شامی نے بالوں کی طرح انسانی ناخنوں کی خرید و فروخت کو بھی منع کیا ہے: آدمی سے جو حصہ الگ ہو جائے' جیسے بال اور ناخن' وہ آدمی کا حصہ ہے' اور اس لیے اس کا دفن کرنا واجب ہے (رد المختار، ۲۴۶/۵)۔

لیکن دودھ کی خرید و فروخت میں فقہا کے اندر اختلاف ہے۔ احناف تکریم انسانیت کا پاس کرتے ہوئے منع کرتے ہیں: عورت کے دودھ کی فروختگی جائز نہیں' اس لیے کہ دودھ انسان کا جز ہے اور انسان اپنے تمام اجزا سمیت مکرم ہے مبتذل نہیں۔ (البحر الرائق ۸۱/۶' نیز عالمگیری ۱۱۴/۳)۔ جب کہ امام شافعی "اس کو جائز قرار دیتے ہیں۔ سرخسی کا بیان ہے: ہمارے نزدیک کسی حال میں عورتوں کے دودھ کی فروختگی جائز نہیں ہے' اور نہ ہی اس کے تلف کرنے والے پر ضمان لازم ہو گا اور امام شافعی نے فرمایا کہ اس کی بیع جائز ہے اور اس کے تلف کرنے والے پر ضمان لازم ہو گا' اس لیے کہ یہ پاک دودھ یا مشروب ہے' جانوروں کے دودھ کی طرح' اور اس لیے کہ یہ اہل دنیا کی غذا ہے پس جائز ہو گا اس کا فروخت کرنا تمام غذاؤں کی طرح اور اس سے ظاہر ہو گیا کہ دودھ مالِ متقوم ہے' اس لیے کسی چیز کی مالیت اور اس کا متقوم ہونا شرعاً وعرفاً اس کے قابل انتفاع ہونے کی وجہ سے ہوتا ہے (المبسوط ۱۲۵/۱۵)۔ فقہا حنابلہ کے درمیان گو اس مسئلہ میں اختلاف ہے' لیکن حنبلی دبستان فقہ کے مشہور ترجمان' ابن قدامہ کے نزدیک بھی ترجیح اسی کو ہے کہ عورت کے دودھ کی خرید و فروخت جائز ہے (المغنی ۴/ ۱۷۷)۔

لہٰذا احناف کے نزدیک بدرجہ مجبوری صرف ایسے اعضا کو خرید کرنا جائز ہو گا جیسا کہ فقہا نے بوقت ضرورت رشوت دینے یا سودی قرض حاصل کرنے کی اجازت دی ہے۔ لیکن شوافع اور حنابلہ کے نزدیک ایسے اعضا کی خرید و فروخت دونوں درست ہوں گی' اس سلسلہ میں ابن قدامہ کی یہ عبارت اور اس کا عموم قابل لحاظ ہے کہ: انسانی اجزا میں سے سب کی خرید و فروخت جائز ہے کیوں کہ غلام اور باندی کی خرید و فروخت جائز ہے (ایضاً)۔

آگے چل کر ابن قدامہ نے گو جسم سے تراشے گئے عضو کی خرید و فروخت کو حرام قرار دیا ہے' مگر یہ اس لیے نہیں کہ انسانی اجزا سے انتفاع جائز نہیں' بلکہ اس لیے کہ اس وقت تک انسانی اعضا سے انتفاع ممکن نہ ہو سکا تھا۔ وحرم بیع العضو المقطوع لانہ لانفع فیہ۔

اب جب کہ ایسا ممکن ہو چکا ہے ابن قدامہ کی تشریح کے مطابق ایسے اعضا کی خرید و فروخت بھی درست قرار پائے گی۔

۱۳۔ تاہم اس سلسلہ میں یہ بات بھی پیشِ نظر رکھی جانی چاہیے کہ خرید و فروخت کے جواز و عدم

جواز میں احناف کی کتب میں جو جزئیات منقول ہیں' ان سے بعض اصول مستنبط ہوتے ہیں۔

ان میں سے ایک اصل یہ ہے کہ بعض چیزیں جو اپنی نجاست یا حرمت کی وجہ سے خرید و فروخت کا محل نہیں ہیں' اگر کسی طور پر قابلِ انتفاع ہو جائیں تو ان کی خرید و فروخت جائز ہوتی ہے۔ مثلاً گوبر کی بیع جائز نہیں ہے کیوں کہ وہ نجس العین ہے' اور مشابہ ہے گندگی (پاخانہ) اور مردار کے چمڑے کے جس کو دباغت نہ دی گئی ہو۔ ہمارا موقف یہ ہے کہ وہ قابلِ انتفاع ہے' اسی لیے اسے فصلوں میں افزایش کے لیے اراضی میں ڈالا جاتا ہے اس لیے وہ مال ہے' اور مال بیع کا محل ہے' بخلاف پاخانہ کے' کیوں کہ اس سے انتفاع مخلوط ہونے پر ہی ہوتا ہے' اور مخلوط کی بیع جائز بھی ہوتی ہے (فتح القدیر ۴۸۶/۸)۔

اسی اصول کی بنا پر امام محمد نے ریشم کے کیڑے کی خرید و فروخت کو درست قرار دیا ہے: رہے ریشم کے کیڑے' تو اس کی بیع امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک جائز نہیں ہے' اس لیے کہ وہ حشرات الارض میں سے ہے۔ امام ابو یوسف کے نزدیک اس کی بیع جائز ہے' جبکہ اس میں ریشم ظاہر ہو جائے' ریشم کے تابع کر کے۔ اور امام محمدؒ کے نزدیک ہر حال میں جائز ہے' اس کے قابلِ انتفاع ہونے کی وجہ سے (البحر الرائق ۸/۶ ۷)۔

دوسری اصل یہ ہے کہ کسی شے کی بیع اصلاً ممنوع ہو' اور وہ کسی نص صریح کے خلاف نہ ہو' لیکن انسانی ضرورت اور تعامل اس کے جواز کی مقتضی ہو' تو ایسے مواقع پر بھی فقہا اس کی خرید و فروخت کو جائز قرار دیتے ہیں۔ مثلاً ابن نجیم ناقل ہیں: جب کہ خریدے علق جسے فارسی زبان میں مرعل کہا جاتا ہے' تو اس کا خریدنا جائز ہے' اور اسی کو صدر الشہید نے لوگوں کی ضرورت کی وجہ سے اختیار کیا ہے کیوں کہ یہ لوگوں کے مال دار ہونے کا سبب بنتا ہے (البحر الرائق ۸/۶ ۷)۔ ابن قدامہ نے بھی اس اصول سے مختلف احکام و مسائل میں استفادہ کیا ہے (المغنی، ۴/۴ ۱۷۶'۱۷)۔

اب یہ امر غور طلب ہے کہ اعضا کی بینکنگ جو ایک طبی ضرورت ہے' اور جن کی بعض خاص حالات میں' مثلاً جنگ' زلزلہ وغیرہ میں' بڑی مقدار میں ضرورت پڑتی ہے' اور فی زمانہ صرف عطیات سے اتنی تعداد میں اعضا مطلوبہ کا ذخیرہ کیا جاتا اور فراہم کرنا بظاہر مشکل ہے' کیا ان اصول و قواعد سے نفع اٹھایا جاسکتا ہے؟

۴۱۔ پس ان مباحث کا حاصل یہ ہے کہ:

(۱)۔۔۔اعضا انسانی کی پیوند کاری کے لیے جو طبی طریقہ ایجاد ہوا ہے' اس میں توہین انسانیت

نہیں ہے۔

(۲)---اس لیے یہ جائز ہے' بشرطیکہ اس کا مقصود کسی مریض کی جان بچانا یا کسی اہم جسمانی منفعت کو لوٹانا ہو' جیسے بینائی۔

(۳)---اور طبیب حاذق نے بتایا ہو کہ اس کی وجہ سے صحت کا غالب گمان ہے۔

(۴)---غیر مسلم کے اعضا بھی مسلمان کے جسم میں لگائے جا سکتے ہیں۔

(۵)--- مردہ شخص کے جسم سے عضو لیا جا رہا ہو' تو ضروری ہو گا کہ خود اس نے زندگی میں اجازت دی ہو' اس لیے کہ وہ جسم کا مالک ہے۔ نیز اس کے ورثا بھی اس کے لیے راضی ہونا ضروری ہے۔

(۶)---زندہ شخص کا عضو حاصل کیا جا رہا ہو' تو ضروری ہو گا کہ خود اس نے اجازت دی ہو اور اس وجہ سے خود اس کو ضرر شدید نہ ہو۔

(۷)---اعضا کی بینکنگ بھی درست ہے۔ شوافع اور حنابلہ کے یہاں اعضا کی خرید و فروخت دونوں کی گنجائش ہے' اور احناف کے نزدیک بدرجہ مجبوری خرید کر سکتے ہیں' فروخت نہیں کر سکتے۔

چند دعوتی تجربے

امام حسن البناؒ شہید
ترجمہ سید حامد علی

ذیل میں "اخوان المسلمین" کے بانی و قائد حسن البنا شہید کی ڈائری سے' جو مذاکرات حسن البنا کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہو چکی ہے' ان کے چند دعوتی تجربے نقل کیے جا رہے ہیں' جو دلچسپ بھی ہیں اور سبق آموز بھی۔

دین کی دعوت و سربلندی کا کام کس طرح ہو' اور افکار و اعتقادات کے اختلاف کے باعث مسلمانوں میں جو پھوٹ پڑ گئی ہے اس سے عہدہ بر آ ہونے کی کیا صورت ہو؟ میں برابر اس فکر میں غلطاں و پیچاں رہا۔ صورت حال یہ تھی کہ جو شخص بھی اسلام کے متعلق کوئی بات منہ سے نکالتا' ہر فریق کم از کم یہ جاننا چاہتا کہ وہ اس کے گروہ کا فرد ہے یا اس کے مخالف گروپ کا آدمی ہے۔ جبکہ میرا مطمح نظر یہ تھا کہ سب سے خطاب کیا جائے' ہر ایک سے تعلقات وابستہ کیے جائیں اور اختلاف کو رفع کر کے ملت کی پھر سے شیرازہ بندی کی جائے۔

ایک عرصے کے مسلسل غور و فکر کے بعد میں نے طے کیا کہ ان تمام گروہ بندیوں سے دُور رہ کر کام کا آغاز کیا جائے۔ اس سلسلے میں بہ خصوصیت سے اس نتیجے پر پہنچا کہ شہر کی مسجدوں میں لوگوں سے خطاب کرنا صحیح نہ ہو گا' کیونکہ بدقسمتی سے مسجدیں اختلافات کا اکھاڑا بن گئی ہیں۔ چنانچہ میں نے عزم کر لیا کہ دعوت و تبلیغ کے لیے میں اس طرف رخ کرنے کے بجائے اور کوئی تدبیر اختیار کروں گا۔۔۔۔ پھر کیوں نہ قہوہ خانوں میں جمع ہونے والے لوگوں سے دعوت کا آغاز کیا جائے ۔۔۔۔ ذہن میں اک تجویز آئی اور میں سوچنے لگ گیا۔

قہوہ خانی درس

یہ خیال بار بار دماغ میں آتا اور پلٹتا رہا' یہاں تک کہ اس نے عمل کی شکل اختیار کر لی۔ چنانچہ میں نے اس مقصد کے لیے تین بڑے قہوہ خانے منتخب کیے' جن میں ہزاروں آدمیوں کا جمگھٹ رہتا تھا۔

ہر ایک قہوہ خانے میں ہر ہفتہ دو بار درس دینے کا اہتمام کیا' اور پوری پابندی کے ساتھ اس درس کو جاری رکھا۔ شروع شروع میں یہ قہوہ خانی درس لوگوں کو بہت عجیب و غریب معلوم ہوا مگر آہستہ آہستہ وہ اس سے مانوس ہو کر اس کی طرف متوجہ ہوتے گئے۔

درس کے لیے میں نے اک نیا طرز اختیار کیا۔ وہ یہ تھا کہ ان موضوعات کو منتخب کیا گیا' جن پر ان لوگوں سے عمدگی کے ساتھ گفتگو ہو سکتی تھی اور جس میں عام نصیحت ہی کو ملحوظ رکھا جا سکتا تھا۔ یعنی اللہ اور آخرت کی یاد دہانی اور ترغیب و ترہیب۔ میں نے تنقید و تعریض سے پرہیز کیا' اور جن منکرات و سیّات میں یہ لوگ مبتلا ہوتے ہیں ان پر انھیں زجر و توبیخ اور ملامت نہیں کی' بلکہ اس بات پر قناعت کی کہ لوگوں کے دل کسی حد تک متاثر ہوں اور بس۔ اس غرض کے لیے میں نے آسان' پُرکشش اور شوق انگیز طرزِ بیان اختیار کیا' نیز کبھی کبھی عوامی زبان کی آمیزش کی' محسوسات' امثال اور حکایات سے کام لیا۔ غرض اس بات کی پوری کوشش کی کہ طرزِ بیان موثر اور جذبات انگیز ہو اور دلوں کو مائل کرنے اور رغبت و شوق کو ابھارنے کا ذریعہ بن سکے۔ اس کے ساتھ اس امر کا بھی خیال رکھا کہ درس طویل اور اکتا دینے والا نہ ہو۔ صرف دس منٹ' یا اگر کبھی طویل ہو گیا تو زیادہ سے زیادہ پندرہ منٹ تک درس رہتا۔ اس اختصار کے باوجود میں نے اس بات کا پورا لحاظ رکھا کہ جس بات کا بیان کرنا مقصود ہو' اس مختصر وقت میں وہ پوری طرح بیان ہو جائے اور سننے والے بخوبی سمجھ جائیں۔ چنانچہ میں آیات و احادیث کا موزوں انتخاب کرتا' پھر خشوع کے ساتھ ان کی تلاوت کرتا' اور اصطلاحی تفسیروں اور فنی شرحوں سے بچ کر اس طرح ان کی توضیح و تشریح کرتا کہ ان کا مجمل مفہوم کھل کر سامنے آ جاتا۔

اس درس کی اسماعیلیہ کے عوام میں شہرت ہو گئی اور جگہ جگہ اس کے چرچے ہونے لگے۔ لوگ قہوہ خانوں میں درس کے منتظر رہتے۔ پھر جن لوگوں نے اس درس کو سنا' خصوصاً وہ سامعین جو پابندی سے آتے رہے' ان پر اس کا بڑا اثر ہوا۔ وہ غفلت سے چونکے' غور و فکر کی طرف مائل ہوئے اور آہستہ آہستہ ان کے ذہنوں میں اس طرح کے سوالات ابھرتے گئے کہ اللہ کا حق کیوں کر ادا ہو' دین و ملّت کی ذمہ داریوں سے کس طرح عہدہ بر آ ہوا جائے اور عذاب سے نجات پانے اور نعمت ابدی حاصل کرنے کے لیے وہ کیا کریں۔ وہ پے در پے اس قسم کے سوالات کرنے لگے' لیکن میں نے شروع شروع میں ان سوالات کے واضح اور قطعی جوابات دینے سے احتراز کیا' اور یہ اس لیے کیا کہ ان میں مزید بیداری پیدا ہو' ان کے دل اور مائل ہوں' اور جو نفوس سرکشی کے عادی رہے ہیں ان میں قبول احکام کی استعداد پیدا ہو جائے۔

عملی تعلیم

ان کی پیاس میرے ان غیر قطعی اور مبہم جوابات سے نہ بجھ سکی ۔ ان میں سے کچھ لوگوں نے اصرار کیا کہ جس راہ پر انھیں چلنا ہے اس کے نشانات سے انھیں ضرور آگاہ کیا جائے ۔ غرض یہ کہ جب ان کا وجدان اسلام کی بنیادوں کے شعور سے جاگ اٹھا' تو ان میں اسلامی احکام کا علم حاصل کرنے کی طلب اور آمادگی پیدا ہوگئی ۔ میں نے اس سلسلے میں انھیں یہ مشورہ دیا کہ وہ ایک خاص مقام منتخب کرلیں' جہاں وہ درس سے قبل یا بعد اسی غرض سے جمع ہوں تاکہ دینی احکام سیکھیں ۔ لوگوں نے اس مشورہ کو قبول کر لیا اور ان کی نظر انتخاب ایک دُور افتادہ خانقاہ پر پڑی جو کچھ مرمت و درستگی کی محتاج تھی ۔

یا اللہ' ان غریبوں کے دل کس قدر پاکیزہ ہیں! یہ کتنی جلد نیکی کی طرف لپکتے اور مسابقت کرتے ہیں جب کہ انھیں کوئی پاکباز اور مخلص داعی مل جاتا ہے ۔ چنانچہ ہمارے بھائی' جن میں راج مزدور بھی تھے' خانقاہ کی مرمت میں ہمہ تن مصروف ہوگئے اور اپنے مقصد کے مطابق اس کی درستی اور مناسب سامان کی فراہمی میں لگ گئے ۔ دو ہی راتیں گزری تھیں کہ ان کی مساعی سے یہ کام بحسن و خوبی انجام پاگیا' اور اس کے بعد خانقاہ میں پہلا اجتماع منعقد ہوا ۔

جمع ہونے والے تمام اشخاص' یا ان کی زیادہ تعداد' زندگی میں پہلی بار نماز پڑھنے کے لیے آمادہ ہوئی تھی ۔ ظاہر ہے کہ یہ لوگ نماز اور وضو وغیرہ عبادات کے طریقے سیکھنے کے محتاج تھے' لیکن اس کے لیے میں نے نہ تو انھیں عبارتوں کی تلقین کی اور نہ نظری طور پر احکام نماز کی تعلیم دی' بلکہ خالص عملی طرز تعلیم اختیار کیا ۔ میں ان سب کو سیدھا وضو کے لوٹوں کے پاس لے گیا' ان میں سے ایک گروہ کو بٹھایا اور ان کی صف بنائی' پھر وضو کا ایک ایک عمل کر کے بتاتا اور ان سے کراتا گیا' یہاں تک کہ انھوں نے پورا وضو کر لیا ۔ اس طرح سب لوگ عمدگی کے ساتھ وضو کرنے لگے ۔ پھر انھیں وضو کے روحانی' بدنی اور دنیوی فواید بتائے' اور وضو کے ثواب کے سلسلے میں جو احادیث نبیؐ سے وارد ہیں انھیں سنا کر ان کے جذبۂ شوق کو برانگیختہ کیا ۔ مثلاً نبیؐ کا یہ فرمان کہ "جو شخص وضو کرتا ہے اور حسن و خوبی کے ساتھ کرتا ہے' اس کا جسم گناہوں سے پاک ہو جاتا ہے ۔ یہاں تک کہ اس کے ناخنوں کے نیچے سے بھی گناہ خارج ہو جاتے ہیں ۔"

وضو سے اس طرح فراغت کے بعد میں نے انھیں بتایا کہ نماز میں کیا کیا کیا جاتا ہے' اور ان سے کہا کہ وہ نماز پڑھ کر مجھے دکھائیں ۔ اس کے ساتھ میں نے انھیں وہ احادیث سنائیں جن میں نماز کے فضائل بیان کیے گئے ہیں' اور ان وعیدوں سے انھیں ڈرایا جو ترک نماز کے سلسلے میں وارد ہوئی ہیں ۔

اسی دوران میں ایک ایک کو سورۂ فاتحہ سنا سنا کر یاد کرائی اور جو چھوٹی سورتیں انھیں یاد تھیں ان کا تلفظ صحیح کرایا۔ اس عرصے میں' میں نے نہ تو ان کے سامنے فقہی مسائل کو مسائل کے انداز میں بیان کیا' اور نہ مشکل اور پرپیچ اصطلاحوں کو استعمال کیا۔ بلکہ گفتگو کو ترغیب و ترہیب سے لبریز باتوں تک ہی محدود رکھا۔ چنانچہ ان کے دل احکام کے لیے نرم پڑ گئے' اور دینی تعلیمات ذہنوں میں وضاحت سے جاگزیں ہوگئیں' اور اس طرح تعلیم کا یہ خالص فقہی گوشہ خشک بننے سے محفوظ رہ گیا۔

اس اثنا میں' میں کتاب اللہ کی آیات' رسول کریمؐ کی احادیث اور سیرِ صالحین کے ذریعہ صحیح عقائد کے پیدا کرنے' پروان چڑھانے اور دلوں میں پیوست کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ اس ضمن میں فلسفیانہ نظریات اور منطقی قیاسات سے کام لینے کے بجائے میں نے لوگوں کو اس کے لیے آمادہ کیا کہ وہ کائنات پر نظر ڈال کر خالقِ کائنات کی عظمت معلوم کریں' اور مخلوقات کے ذریعے اس کی بلند و برتر صفات کی معرفت حاصل کریں۔ اسی طرح آخرت کی یاددہانی تذکیر و وعظ کے انداز میں کرتا۔ پھر کسی فاسد عقیدے کو اسی وقت ڈھانے کی کوشش کرتا' جب صالح عقیدہ ذہن میں بٹھا چکا ہوتا۔ تعمیر کے بعد ڈھانا کس قدر آسان ہے اور اس سے قبل کس قدر مشکل! یہ ایک دقیق نکتہ ہے جو مصلحین و داعلین کی نظروں سے بالعموم اوجھل ہو جاتا ہے۔

اختلافات کا فتنہ

یہ درس مغرب سے عشا تک ہوتا' جس کے بعد قہوہ خانوں میں درس کے لیے جانا ہوتا۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ اس درس کا عام چرچا ہوگیا اور بہت سے لوگ اس میں شریک ہونے لگے۔ ان شرکا میں وہ اختلاف پسند اور جنگجو عنصر بھی تھا جو پچھلی فتنہ انگیزی میں حصہ لے چکا تھا۔

ایک رات کو میں نے سامعین میں عجیب و غریب روح محسوس کی: افتراق اور جنگ کی روح۔ میں نے دیکھا کہ سامعین ایک دوسرے سے جدا اور مختلف گروہوں کی شکل میں علاحدہ علاحدہ بیٹھے ہیں۔ میں درس شروع بھی نہ کر سکا تھا کہ یکایک مجھ سے سوال ہوا: "مولانا' توسل کے مسئلے میں آپ کی کیا رائے ہے؟"

جواب میں' میں نے کہا: "میرے بھائی' میرا خیال یہ ہے کہ آپ مجھ سے صرف یہی سوال نہیں کرنا چاہتے' بلکہ یہ بھی پوچھنا چاہتے ہیں کہ اذان کے بعد صلوٰۃ و سلام پڑھنا کیسا ہے؟ جمعہ کے دن سورۂ کہف کی تلاوت کی جائے یا نہیں؟ تشہد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے "سیدنا" کے لفظ کا استعمال صحیح ہے یا نہیں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین کا ٹھکانا آخرت میں کہاں ہے؟ قرآن پاک کی تلاوت کا ثواب میت کو پہنچتا ہے یا نہیں؟ صوفیا کے حلقے باعث معصیت ہیں یا ذریعہ تقرب

خداوندی؟ یہ اور انھی جیسے مسائل کے بارے میں بھی آپ دریافت کرنا چاہتے ہیں؟"

غرض میں نے وہ تمام اختلافی مسائل گنا دیے جو پچھلے فتنے اور ان لوگوں کے شدید اختلافات کا اصل سبب تھے۔ مستفسر کو میرا یہ جواب بہت عجیب و غریب معلوم ہوا' اور اس نے کہا: "جی ہاں ' میں ان سب سوالات کا جواب چاہتا ہوں"۔

میں نے ان سے کہا: "میرے بھائی' میں ایک عام شہری آدمی اور مدرس ہوں' بعض آیات و احادیث اور کتابوں کے مطالعے سے بعض دینی احکام یاد کر لیتا ہوں' اور لوگوں کو تطوعاً سنا دیتا ہوں۔ اس سے زیادہ کا اگر آپ مجھ سے مطالبہ کریں گے تو اس کا پورا کرنا میرے لیے دشوار ہو گا۔ پھر یہ بھی تو سمجھیے کہ جس شخص نے کسی مسئلے میں یہ کہہ دیا کہ "میں نہیں جانتا" اس نے اپنی حد تک فتویٰ دے دیا۔ اس لیے میں جو کچھ کہتا ہوں' اگر آپ کو پسند آئے اور اس میں اپنی بہتری معلوم ہو تو اس کو منیے' میں آپ کا شکرگزار ہوں گا' اور اگر آپ کو زیادہ تحقیق و تدقیق مطلوب ہے تو دوسرے علما سے جو اختصاص کا مرتبہ رکھتے ہیں' پوچھ لیجیے۔ باقی میرا مبلغ علم تو بس یہی ہے' اور اللہ تعالیٰ نے بھی ہر شخص کو اس کی وسعت کے مطابق ہی مکلف ٹھیرایا ہے"۔

یہ جواب سن کر سائل کو خاموش ہونا پڑا اور حاضرین یا ان میں سے اکثر اصحاب کو بھی یہ جواب پسند آیا۔ لیکن میں نے موقع کو غنیمت جانتے ہوئے مزید کہا: "بھائیو' میں خوب جانتا ہوں کہ سوال کرنے والے بھائی اور آپ میں سے اکثر صاحبان کا اس سوال سے منشا کیا تھا۔ درحقیقت آپ یہ جاننا چاہتے تھے کہ درس دینے والا یہ نیا شخص کس گروہ سے تعلق رکھتا ہے۔ لیکن میں آپ سے سچ عرض کرتا ہوں کہ اس بات کے جان لینے سے آپ کو کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ آپ لوگ کامل آٹھ سال اختلافات اور فتنہ و فساد کی نذر کر چکے ہیں' کیا اتنی مدت اس جیسے کام کے لیے کافی نہیں ہے جو آپ مزید ان مسائل میں الجھنا چاہتے ہیں۔ یہ وہ مسائل ہیں جن کی وجہ سے مسلمان صدہا سال سے اختلاف و عناد کا شکار رہے ہیں' حالانکہ اللہ تعالیٰ کو ہمارا اتحاد اور باہمی محبت محبوب ہے اور تفرقہ و اختلاف ناپسند و مبغوض۔ تو کیا میں امید کروں کہ آپ سب صاحبان میرے سامنے متفقہ طور پر اللہ سے یہ عہد و پیمان کریں گے کہ آج سے آپ ان جھگڑوں میں حصہ نہ لیں گے' بلکہ اس بات کی کوشش کریں گے کہ دین کے اصول و مبادی کا علم حاصل کریں' دین کے عمومی اخلاق و اعمال اختیار کریں' اس کے تکلف و تعمق کو چھوڑ دیں' یہاں تک کہ دل صاف ہو جائیں اور لوگوں میں یہ وصف پیدا ہو جائے کہ وہ حق کو معلوم کرنے کے درپے ہوں' نہ کہ کسی خاص خیال کی پچ کے۔ جب یہ کیفیت پیدا ہو جائے گی تو ہم ان تمام معاملات پر محبت' اعتماد' اتحاد اور خلوص کے ساتھ باہم تبادلہ خیال کر سکیں گے"۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا' ہم درس سے یہی عہد و پیمان کر کے اٹھے کہ ہم دینِ حنیف پر عمل پیرا ہونے اور اس کی خدمت کرنے میں متفق و متحد رہیں گے' اور اختلافی مسائل میں اپنی اپنی رائے پر قائم رہتے ہوئے بحث و مباحثے سے اجتناب کریں گے۔ اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ اس کے بعد یہ درس ہمیشہ اختلاف و عناد سے پاک فضا میں جاری رہا۔ اس کے ساتھ میں نے ایک اور تدبیر بھی اختیار کی۔ میں اخوت کے مختلف پہلوؤں کو گفتگو کا موضوع بنانے لگا تاکہ دلوں میں بھائی چارے کا گہرا نقش بیٹھ جائے۔ نیز میں اختلافی مسائل کو بیان کرتا' اور اس بات کی مثالیں دیتا کہ سلف صالح رحمہم اللہ کس طرح اختلافات میں رواداری اور تسامح برتتے تھے۔ اس طرح یہ حقیقت ان کے سامنے آجاتی کہ ان سب لوگوں کو بھی اختلافی امور میں رواداری اور دوسروں کی رایوں کے احترام کا رویہ اختیار کرنا چاہیے۔

اس دوران میں' میں گہری نظر سے لوگوں کا اور ان کے طور و طریق کا مطالعہ کرتا رہا' اور یہ جاننے کی کوشش کرتا رہا کہ اس نئی سوسائٹی میں موثر عوامل کون کون سے ہیں۔ اس مطالعے کے نتیجے میں مجھے معلوم ہوا کہ یہ عوامل چار ہیں: علما' صوفیا' لیڈر' جماعتیں۔

علما

میں نے علما کے ساتھ خلوص اور احترام کا رویہ اختیار کیا' اور اس کا پورا لحاظ رکھا کہ کسی درس یا تقریر میں ان سے آگے بڑھنے کی جرات نہ کروں۔ چنانچہ میرے درس دینے کے دوران میں اگر کوئی عالم دین تشریف لے آتے تو اپنی جگہ ان کے لیے خالی کر دیتا اور انھیں آگے بڑھا دیتا' میرے اس طرزِ عمل سے علما متاثر ہوئے اور اس طرح میں ان سے اپنے حق میں کلمۂ خیر پا سکا۔

اس سلسلے میں ایک عجیب واقعہ ہوا۔ ایک قدیم طرز کے عالم دین مجھے تنگ کرنے کے درپے ہو گئے۔ ان بزرگ نے جامعہ ازہر میں سالہا سال گزارے تھے' اور اب ان کا محبوب مشغلہ یہ تھا کہ بحث و تکرار اور موشگافیاں کریں۔ یہ بزرگ عجیب و غریب مسائل چھیڑتے' ایسے معانی و مطالب بیان کرتے جو قدیم حواشی اور دقیق اور پُرپیچ بحثوں میں پائے جاتے ہیں' اور اس طرح علما' واعظین اور مدرسین کو پریشان کرتے۔ میں ایک روز حضرت ابراہیمؑ کے واقعات زندگی لوگوں سے بیان کر رہا تھا' کہ ان بزرگ نے مجھ سے پوچھا: "حضرت ابراہیمؑ کے والد کا کیا نام ہے؟" اس پر میں نے مسکرا کر کہا: "حضرت' مورخین نے کہا ہے کہ ان کا نام تارخ تھا' اور آزر ان کے چچا کا نام تھا' لیکن قرآن مجید کا بیان ہے کہ آزر ان کے باپ کا نام ہے۔ مگر اس بات کے مان لینے سے بھی کوئی دشواری پیش نہیں آتی کہ آزر ان کے چچا کا نام ہو' کیونکہ عربی میں چچا کو باپ بھی کہہ دیا کرتے ہیں"۔

یہ اس سوال کا کافی و شافی جواب تھا' مگر ان حضرت کو یہ گوارا نہ ہوا کہ میدان کو اس آسانی کے

ساتھ ہاتھ سے نکل جانے دیں' چنانچہ انھوں نے ایک اور اعتراض جڑ ہی دیا' فرمایا: "ولیکن ان کے باپ کا نام تارخ "ر" کے پیش سے ہے نہ کہ تارخ "ر" کے زیر سے"۔ میں نے جواب میں کہا: "ہو سکتا ہے کہ یہی ہو' یہ لفظ بہرحال غیر عربی ہے' اور اس کا صحیح تلفظ اسی وقت ممکن ہے جب اس زبان میں مہارت ہو' جس کا یہ لفظ ہے' جبکہ میرا مقصود تو صرف موعظت و نصیحت ہے"۔

ان بزرگوار نے صرف اس چھیڑ خانی پر بس نہیں کیا' بلکہ ان کی کوشش یہ رہی کہ ہر روز درس میں یہی روِش اختیار کریں۔ اس لاطائل گفتگو کا حاصل اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ عوام اور سامعین بھاگ کھڑے ہوں اور اس بے سود بحث کے لیے ان دونوں "ملاؤں" کو چھوڑ جائیں۔ آخر میں نے ان حضرت کا علاج سوچا' اور وہ یہ تھا کہ میں نے انھیں اپنے گھر بلا کر ان کا اعزاز و اکرام کیا اور اچھی طرح خاطر مدارات کی' اور فقہ اور تصوف کی دو کتابیں ان کی خدمت میں تحفتاً پیش کیں' اور آیندہ کے لیے یقین دلایا کہ جو کتابیں بھی وہ پسند فرمائیں گے' میں ان کو بخوشی نذر کر دوں گا۔

میرے اس طرزِ عمل سے وہ بزرگ بہت خوش ہوئے۔ اس کے بعد وہ پابندی سے درس میں تشریف لاتے رہے' اور پوری توجہ سے میری معروضات کو سننے لگے۔ نیز لوگوں کو اصرار اور الحاح کے ساتھ درس میں شرکت کی دعوت دینے لگے۔ یہ دیکھ کر میں نے اپنے دل میں کہا' اللہ کے رسول ؐ نے سچ فرمایا تھا' تھادو اتحابوا' ایک دوسرے کو ہدیہ دو' اس طرح تم میں باہم محبت ہو جائے گی۔ یہ طریقہ ایک مدت تک کامیابی سے چلتا رہا۔

صوفیا

شیوخ کے ساتھ میں اسی طرح پیش آتا جس کا تصوف و سلوک مقتضی تھا۔ جب ہم تنہائی میں بیٹھتے تو ان میں سے ہر ایک کے سامنے مسلمانوں کی زبوں حالی کو کھول کر بیان کرتا اور بتاتا کہ وہ اپنے دین سے ناواقف ہیں' ان کا باہمی شیرازہ بکھر چکا ہے۔ پھر میں انھیں بتاتا کہ مسلمانوں کی چھاؤنیوں پر الحاد اور اخلاقی ابتری کے حملہ آور ہونے کی وجہ سے ان کی دینی حیثیت کتنے عظیم خطرات سے دوچار ہے اور ان کے بہترین علاقوں پر اغیار کے غلبہ و تسلط کی وجہ سے ان کی سیاسی و مادی حالت کس قدر تشویشناک ہے۔ آخر میں' میں ان سے درخواست کرتا کہ وہ اپنے پیروؤں کی فکری اصلاح کریں' ان کی صحیح اسلامی تربیت کریں' اور اسلام کو سربلند کرنے کی جدوجہد کے لیے انھیں منظم و متحد کریں۔

اس ذیل میں شیخ عبدالوہاب دندراوی مجھے اکثر یاد آتے ہیں۔ وہ بیس یا اکیس سال کے نوجوان تھے اور اس طرح گویا میرے ہم عمر۔ ان میں مجھے صلاح و خیر کے آثار نظر آئے۔ چنانچہ میں نے حسب دستور عام محفل میں ان کا پورا احترام کیا۔ جب یہ مجلس عام ختم ہوئی تو میں نے ان سے کہا کہ میں آپ

سے ایک کمرے میں تنہا ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔ جب ہم دونوں کمرے میں پہنچے تو میں نے اپنی ٹوپی اتار کر کرسی پر رکھ دی اور ان کا عمامہ بھی اتار لیا اور اسے ٹوپی کے قریب رکھ دیا۔ میری اس حرکت پر انھیں سخت حیرت ہو رہی تھی۔ میں نے ان سے کہا: "میرے بھائی' میری اس حرکت پر آپ برا نہ مانیں۔ میں نے یہ اس لیے کیا کہ جب آپ سے میری گفتگو ہو تو اس عبدالوہاب دندراوی سے ہو جو بس ایک مسلم نوجوان ہے' کیونکہ شیخ عبدالوہاب کو تو ہم وہیں مجلس عام میں چھوڑ آئے ہیں"۔

پھر میں نے ان سے کہا: "میرے بھائی' آپ کی عمر صرف بیس اکیس سال ہے اور آپ ماشاء اللہ شباب' قوت اور شجاعت کا پیکر ہیں۔ کیا آپ کبھی اس بھیڑ کے حالات پر بھی غور و فکر کرتے ہیں جو آپ کے گرد جمع ہو گئی ہے۔ آپ ذکر اور اشعار خوانی میں رات گزار دیتے ہیں اور بس' پھر کچھ نہیں کرتے۔ کیا آپ کو یہ پسند ہے؟ کیا آپ اس حالت پر مطمئن ہیں؟" اس پر شیخ عبدالوہاب دندراوی بولے: "تو میں کیا کروں"۔ میں نے کہا: "تعلیم' تنظیم' نگرانی اور سلف صالح کی سیرت اور مجاہد و سرفروش بزرگوں کی تاریخ کے مطابق ان کی تربیت" ---- ان ہی نقاط پر ہماری گفتگو دیر تک جاری رہی' جس سے شیخ نے گہرا اثر قبول کیا اور ہم نے عملی جدوجہد کے لیے باہم عہد و پیمان کیا۔

اکابر اور لیڈر

اسماعیلیہ کے اکابر اور باہر سے آنے والے سرکاری ملازمین دو گروہوں میں بٹے ہوئے تھے۔ لیکن میں یہ روش اختیار نہیں کر سکتا تھا' کیونکہ میں محسوس کر رہا تھا کہ عام دعوت کا' جو اخوت و محبت کی دعوت ہے' فطری تقاضا یہ ہے کہ میں دونوں کیمپ کے لیڈروں سے ملوں' اور میرا یہ ملنا لوگوں کو بخوبی معلوم ہو۔ چنانچہ جب میں کسی ایک گروہ کے لیڈر کے پاس جاتا تو عمداً دوسرے فریق کے لیڈر کی طرف سے انھیں باور کراتا کہ دوسرے فریق کے لیڈر کے دل میں ان کے لیے جذبہ خیر ہی موجود ہے' اور وہ اچھے انداز میں ان کا ذکر کرتے ہیں۔ نیز میں اس بات پر بھی زور دیتا کہ دونوں شہر کی فلاح و بہبود کے معاملہ میں باہم تعاون کریں کہ یہی اسلامی ہدایات کے عین مطابق ہے۔ اگر میرے سامنے کوئی شخص کسی فریق کے یہاں بیٹھ کر دوسرے فریق کی برائی کرتا تو میں اسے ٹوک دیتا' اور اس سے عرض کرتا کہ "بھائی' خوبی اور بھلائی اسی میں ہے کہ آپ دونوں میں صلح و آشتی پیدا کرنے کا ذریعہ بنیں۔ اس طرح دونوں گروہ مجھ سے محبت اور میرا احترام کرنے لگے۔ یہ اسی طرزِ عمل کا نتیجہ تھا کہ جب بعد میں "اخوان" کی دعوت اہلِ اسماعیلیہ کے سامنے آئی تو مختلف طبقات نے متفقہ طور پر اس دعوت کو لبیک کہا۔

آج کا جرمنی اور اسلام

مسلم سجاد

مشرقی اور مغربی جرمنی کے اتحاد کے بعد جرمنی یورپ کی ایک اہم طاقت کی حیثیت سے پھر اپنا مقام بنا رہا ہے۔ مستقبل کی یک قطبی دنیا میں' جاپان کی طرح' جرمنی کو بھی اپنے مقام کی فکر ہے۔ اس کے پیش نظر ایک ایسی دنیا ہے جس میں طاقت کے دو نہیں' کئی مراکز ہوں۔ کچھ نئے ممالک کو بھی سلامتی کونسل میں ویٹو کا حق ملے اور جرمنی کا شمار عالمی طاقت کی حیثیت سے ہو۔

اس پس منظر میں' مسلم دنیا کے لیے جرمنی کے حالات کا مطالعہ غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔ خصوصاً اس لحاظ سے کہ آج وہاں اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں کیا رویہ اختیار کیا جا رہا ہے۔

مسلم دنیا اور جرمنی کے حلیفانہ تعلقات ماضی میں خوشگوار رہے ہیں۔ جنگ عظیم اول میں سلطنت عثمانیہ اور جرمنی کے باہم حلیفانہ تعلقات تاریخ کے طالب علموں کے لیے کوئی ماضی بعید کی بات نہیں ہیں۔ جرمن مستشرقین کی علمی روایت میں اسلام کے خلاف تعصب نسبتاً کم رہا ہے۔ جرمن سیاستدان بھی' جرمنی کے غیر استعماری کردار پر فخر کرتے ہیں اور مسلم اور عرب دنیا کے ساتھ 'حاکم اور محکوم کے بجائے' برابری کی سطح کے تعلقات کے قائل رہے ہیں۔ گذشتہ دنوں پاکستان میں گوئٹے انسٹی ٹیوٹ نے ایک پاکستانی تحقیقی ادارے کے تعاون سے اسلام اور مغرب کے موضوع پر اہم شہروں میں سیمینار منعقد کیے اور جرمنی اور پاکستان کے اہل علم کو تبادلہ خیال کا موقع فراہم کیا۔ احیائے اسلام کی موجودہ لہر کے پس منظر میں' اسے جرمنی کی جانب سے مستقبل کے عالم اسلام کو سمجھنے کی ایک کوشش قرار دیا جا سکتا ہے۔ لیکن خود جرمنی میں اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ جو رویہ آج ہے اسے بیان کرنے سے پہلے کچھ بنیادی معلومات کا علم ضروری ہے۔

مسلمان آبادی

۱۹۸۷ کی مردم شماری میں مذہب کے بارے میں بھی سوال تھا جس سے یہ معلومات حاصل

ہوئیں کہ مسلمانوں کی کل آبادی ۱۶ لاکھ ۵۱ ہزار ہے۔ ان میں ترکوں کے علاوہ مراکشی، تیونسی، لبنانی، فلسطینی اور پاکستانی بھی شامل ہیں۔ ۴۸ ہزار جرمن شہری بھی مسلمان تھے لیکن ان میں زیادہ تر وہ تھے جنھوں نے جرمن شہریت اختیار کر لی تھی، صرف ۵ ہزار جرمن نو مسلم تھے۔

۱۹۵۰ کے عشرے میں جرمن معیشت کی ضروریات پورا کرنے کے لیے مزدوروں کی حیثیت سے ترک مسلمانوں کی آمد شروع ہوئی۔ ۶۳-۱۹۶۰ میں ان کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔ ۱۹۷۲ میں پھر ایک لہر آئی اور اب آنے والے صرف مرد ہی نہ تھے۔ خواتین بھی مزدور بھرتی ہوئیں اور اہل خانہ بھی آنا شروع ہوئے۔ اس طرح جرمنی میں ترک بستیاں وجود میں آئیں۔ غیر قانونی آمد میں بھی اضافہ ہوا۔ جرمنی کی صحت، تعلیم اور دوسری معاشرتی سہولتوں پر ان کا دباؤ محسوس ہونا شروع ہوا۔

جرمنی کی حکومت نے ان تارکین وطن کو حدود میں رکھنے کی پالیسی اختیار کی ہے۔ انھیں 'مہمان کارکن' کہا جاتا ہے۔ کبھی کبھی واپسی کے لیے بھی اقدامات کیے جاتے ہیں۔ انھیں جرمن شہریوں کے برابر سہولتیں اور حقوق نہیں دیے جاتے۔ بلدیاتی سطح پر ووٹ کا حق دینے کی بھی مزاحمت کی جاتی رہی ہے۔

جرمنی کا دستور اور مذہب

جرمنی کا دستور جسے 'بنیادی قانون' کہا جاتا ہے عبادت، تعلیم اور انجمن سازی کی آزادی کی ضمانت دیتا ہے۔ فرانس اور ہالینڈ کے برخلاف، یہ مذہب کے معاملات میں غیر جانبدار ہے۔ یہودی، کیتھولک اور پروٹسٹنٹ عبادت گاہوں کو کارپوریشن کی حیثیت حاصل ہے، اور حکومت چرچ کے ممبران سے ٹیکس جمع کر کے، اپنے سروس چارجز منہا کر کے، رقم چرچ کے حوالے کر دیتی ہے۔ چرچ اور حکومت تعلیم، صحت اور معاشرتی بہبود کی دیگر سرگرمیوں میں قریبی تعاون کرتے ہیں۔ سرکاری خرچ پر چلنے والے ۸۰ فیصد نرسری اسکولوں کا انتظام چرچ کے سپرد ہوتا ہے۔

مسلم تنظیمیں

جن مذہبی گروہوں کو اس طرح کی حیثیت حاصل نہیں، وہ انجمن سازی کے قواعد کے تحت آزادانہ سرگرمیاں کر سکتی ہیں۔ مسلمان بالعموم رجسٹرڈ تنظیموں اور فاؤنڈیشن کی شکل میں کام کرتے ہیں۔ ان کی تمام سرگرمیاں ان کے دائرہ کار میں آجاتی ہیں۔ سب سے اہم تو مسجد کا نظم ہے۔ دوسری جنگ کے بعد فرینکفرٹ اور ہیمبرگ میں سب سے پہلے احمدیوں نے عبادت گاہیں قائم کیں۔ ۵۰ کے عشرے میں آنے والوں کی ضرورت کے تحت گیراجوں، فلیٹوں اور کمروں میں مسجد کا نظم قائم کیا جانے

لگا۔ صنعتی علاقے RUHR میں ؛ ہمبرگ میں ۸ فی صد مسلم آبادی ہے۔ پہلی مسجد ۱۹۷۲ میں قائم ہوئی اور اب ۳۰ سے زائد ہیں۔

مسلمانوں میں کام کرنے والی بیشتر تنظیمیں ترک ہیں۔ سب سے اہم حکومت ترکی کی سرپرستی میں کام کرنے والی DITIB ہے جو نصف سے زائد مسجدوں کا نظم و نسق چلاتی ہے۔ 1981 کے ایک اندازے کے مطابق ترک مسجدوں کی تعداد ایک ہزار تھی۔ دوسرے نمبر پر AMGT ہے جسے رفاہ پارٹی کا نمائندہ کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد VIKZ ہے' جسے ترکی میں سلیمانیہ کہا جاتا ہے۔ قرآنی اسکول ان کی خاص سرگرمی ہے۔ سعید نورسی کے پیروکاروں کی نوری تنظیمیں بھی ہیں۔ غیر ترکی انجمنوں میں دو عرب تنظیمیں ہیں جن کے صدر دفاتر آخن اور میونخ کے اسلامی مراکز میں ہیں۔ ہمبرگ کا اسلامی مرکز ایرانیوں کا ہے۔ اس کے علاوہ کوسوو' بوسنیا اور پاکستان و بھارت کے مسلمانوں کی انجمنیں بھی ہیں۔ کوئی ایسی چھتری نہیں ہے جس کے تحت یہ سب کام کرتی ہوں' ایک فیڈریشن قائم کی گئی ہے۔

جرمن مسلمانوں کی سرگرمیاں

جرمن نومسلموں کی سرگرمیاں بھی قابل ذکر ہیں۔ ۱۹۷۶ کے بعد سے ہر سال قومی سطح پر اسمبلی ہوتی رہی ہے۔ اب شرکا کی تعداد میں اضافہ کی وجہ سے' علاقائی سطح پر ہر سال مزید تین کانفرنسیں ہوتی ہیں۔ یہ صرف جرمن بولنے والے مسلمانوں کے لیے ہوتی ہیں اور جرمن مسلمان ہی اس کا انتظام و انصرام کرتے ہیں۔ ۷۶ کے پہلے اجلاس میں حاضری ۳۰ تھی' مگر اب سیکڑوں میں ہونے لگی ہے۔ جرمن معاشرہ کے تقاضوں کے تحت اور مقامی سطح پر زیادہ قریب جانے کے لیے اب ملک تین مختلف علاقوں میں جو پروگرام ہوتے ہیں' ان میں حاضری ۱۰۰ تک رہتی ہے۔ قومی سطح کے اجلاس میں ۵۰۰ تک افراد جمع ہوتے ہیں۔ ۸۰ کے عشرے کے اوائل سے اہم اسلامی ایام منانے کے عنوان سے دعوتی سرگرمی کی جاتی ہے۔ کسی اہم شہر میں ایک ہفتہ مناتے ہیں جہاں نمائش' تقاریر اور دیگر ذرائع سے قریب رہنے والے غیر مسلموں کو اسلام کی طرف دعوت دی جاتی ہے۔ ایک آزاد ادارہ 'ہاؤس آف اسلام' جرمن زبان میں دعوت و تربیت کا کام کر رہا ہے۔

خلیج کی جنگ کے بعد

امت کے ایک جزو کی حیثیت سے جرمنی کے مسلمان بھی عالمی سطح پر مسلمانوں کو پیش آنے والے مسائل و واقعات سے متاثر ہوتے ہیں۔ خلیج کی جنگ کے بعد اسلام اور مسلمانوں کے خلاف پروپیگنڈہ کا ایسا طوفان اٹھا جس کے سامنے دعوتی سرگرمیاں ماند پڑ گئیں۔ بعض اوقات اس کا یہ فائدہ بھی ہوا

کہ زیادہ لوگوں نے براہ راست معلومات حاصل کرنے کے لیے قرآن کے تراجم حاصل کیے لیکن بحیثیت مجموعی اس مہم نے مسلمانوں سے فاصلے بڑھا دیے' تعصبات کو مضبوط کر دیا اور بے اعتمادی اور دشمنی کا ماحول پیدا کر دیا۔ اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ مسلمان خصوصاً عرب' راہ چلتے جملہ بازی اور حملوں کا نشانہ بنے' پولیس تفتیش کے مراحل سے گزرے اور خفیہ پولیس کی نگرانی ہونے لگی۔ جرمنی یا یورپ میں کوئی جنگ نہ تھی' خلیج کی جنگ میں جرمن سپاہی بھی نہیں لڑ رہے تھے' لیکن پھر بھی حکومت اور عوام کے بہت بڑے طبقہ کی نظروں میں مسلمان کو دشمن کی نظر سے دیکھا جانے لگا۔ نسلی تعصب اتنا بڑھا کہ گھروں پر حملے ہوئے' ایک ترک گھرانہ جلا دیا گیا' لیکن اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کے بجائے معاشرہ نے بحیثیت مجموعی اسے قبول کر لیا۔ پولیس نے بھی خاموش تماشائی کا کردار ادا کیا۔

میڈیا مہم

خلیج کی جنگ نے جیسے پورا منظرنامہ تبدیل کر دیا۔ ذرائع ابلاغ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف نفرت پھیلانے اور جھوٹے الزامات کی مسلسل مہم میں مصروف ہیں' اور اب تو بیشتر سیاستدان اور اہل علم بھی جیسے اس کے اسیر ہو گئے ہیں۔ سیاسی اور ثقافتی قائدین' فرانس کے نقش قدم پر چلتے ہوئے' سیکولرزم کے عقیدہ کے محافظ بن گئے ہیں۔ اس سے قبل ایک عام جرمن باشندہ دلچسپی' ہمدردی اور دوستی کا رویہ رکھتا تھا لیکن میڈیا مہم نے اسے بھی بدل کر رکھ دیا ہے۔ نشریاتی لہریں جو کبھی دوستی کے پیغام لے جاتی تھیں اب نفرت اور دشمنی کی صداؤں اور مناظر سے بھری ہوئی ہیں۔ کوئی دن نہیں گزرتا کہ جرمن ذرائع ابلاغ اپنے کروڑوں ناظرین و سامعین کو یہ نہ جتاتے ہوں کہ سرخ خطرہ کے بعد اب انھیں سبز خطرے کی فکر کرنا ہے۔ جرمن صحافی اور نامہ نگار Feinbild Kommnnismus (دشمن کمیونزم) کی جگہ Feinbild Islam (یعنی دشمن اسلام) کی تصویر کے نقش و نگار پیش کرنے کو سب سے اہم فریضہ تصور کرتے ہیں۔ ان کی نظروں میں اسلام ایک جامد اور قدیم مذہب ہے' جس کا آج کی دنیا میں کوئی مقام نہیں۔ یہ بتانے کا کوئی موقع جانے نہیں دیا جاتا کہ مسلمان وحشی ہیں' کسی پولیس اسٹیٹ کی سفاک پالیسیوں کو شریعت کے مترادف قرار دیا جاتا ہے' امت کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان سب کچھ تباہ کرتے ہوئے آگے بڑھتے چلے آ رہے ہیں۔

حال ہی میں جرمنی کے سب سے بڑے نشریاتی چینل Bayern-3 پر سوڈان پر ایک رپورٹ پیش کی گئی' جس میں جنوب کے پیچیدہ مسئلے کو عیسائی مسلمان صلیبی جنگ کے طور پر پیش کیا گیا' اور رپورٹر نے کامل یقین کے ساتھ بتایا کہ یہاں اسلامی بنیاد پرست نسل کشی کر رہے ہیں اور عیسائیوں کو غلام بنانے کے لیے زبردستی مسلمان کر رہے ہیں۔ انھی دنوں جرمن ٹیلیویژن RTL پر ایک پروگرام

Terror Im Namen Allahs پیش کیا گیا۔اس کا موضوع تھا: دنیا کے تمام آزادی پسند لوگوں کے لیے ایک ایسے اسلامی بنیاد پرست گروہ کا خطرہ جو ساری دنیا کو فتح کرنا چاہتا ہے۔ جرمن ٹی وی پر "اسلام کی تلوار" کے نام سے ایک سیریز چل رہی ہے ' اور روس کی سابقہ مسلم ریاستوں پر ایک دستاویزی فلم پیش کی گئی ہے۔ یہ دونوں پروگرام ایک نام نہاد ماہر اسلام Peter Scholl-Latour نے تیار کیے ہیں۔ دونوں میں بار بار یہ بات پیش کی جاتی ہے کہ اسلام امن عا) کے لیے خطرہ ہے ' اس کے جنونی پیروکار آزادی ' عدل اور مساوات کے دشمن ہیں ' اور مغرب کو پانی سر سے اونچا ہو جانے سے پہلے اسلامی طاقتوں پر حملہ کر دینا چاہیے۔کچھ دوسرے جرمن اہل علم نے لاطور کے اس پروگرام کی مذمت کی ہے لیکن مسلمانوں کی منفی تصویر مسلسل پیش کیے جانے کا مجموعی تاثر تو نقصان دہ ہی ہے۔

Tubingen کی یونیورسٹی کے ایک حالیہ سروے میں پوچھا گیا کہ لفظ اسلام سے وہ کیا مراد لیتے ہیں؟ معلوم ہوا کہ جرمن عوام کی اکثریت کے نزدیک یہ جنونیوں اور وحشیوں کا مذہب ہے۔ یہ توسیع پسندانہ ' دقیانوسی 'جنونی ' انقلابی اور ظالمانہ ہے۔تشدد اور عدم رواداری کا پرچار کرتا ہے۔ استبداد کا حامی ہے اور خواتین سے امتیازی سلوک کرتا ہے۔ صرف ایک اقلیت نے اسلام کو ایک قابل احترام تہذیب تشکیل دینے والا مذہب قرار دیا جس سے باطنی سکون و مسرت حاصل ہوتی ہے۔ یہ مطالعہ Der Islam in den Medien یعنی میڈیا میں اسلام کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہو چکا ہے۔ تحقیق کاروں کی رائے میں عوام کی یہ رائے میڈیا مہم کے اثرات کی وجہ سے ہے۔

اسلام کے ماہرین سکالر

میڈیا مہم کو غذا پہنچانے والے وہ 'ماہرین' ہیں جو کسی مسئلہ پر پروڈیوسر کی رائے کی تائید میں اظہار خیال کرتے ہیں۔ معروف جرمن مسلمان اسکالر امان ہابام کے الفاظ میں "اگر آپ کو کسی ایسے اسکالر کی ضرورت ہے جو یہ بتائے کہ مسلمانوں کی کاٹنے والی جنونی کالی آنکھیں ہوتی ہیں ' وہ ایک ہاتھ میں کلاشنکوف اور دوسرے ہاتھ میں قرآن لے کر چلتے ہیں تو فکر نہ کریں۔کوئی بھی رائے ہو 'کتنی ہی بے بنیاد کیوں نہ ہو ' جرمن ٹی وی ایسے 'ماہر' کو تلاش کر لیتا ہے جو 'معروضی ' رائے دینے کے لیے تیار ہوتا ہے"۔

جمہوریہ جرمنی کی تمام یونیورسٹیوں میں ایسے سکالر اور محققین موجود ہیں جو احیائے اسلام کے خطرات سے آگاہ کرنے کے لیے مسلسل مقالے لکھ رہے ہیں۔ یونیورسٹی آف Gottingen کے پروفیسر بسام تیبی (Bassan Tibi) نے بنیاد پرست چیلنج کے عنوان سے ایک کتاب لکھی ہے۔ یہ سکالر

اسلامی فکر کی مخالفت کرتا ہے لیکن اسلام کی بحیثیت مجموعی مذمت نہیں کرتا۔ اس کی رائے میں بھی اسلامی فکر کا موجودہ مرکزی دھارا اور مغرب 'تصادم کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ یہ فکر ' جدید دور کے لیے ناقابل عمل اور غیر معقول ہے۔ اس کی نظر میں جو مسلمان سیکولرزم کو مسترد کرتا ہے ' وہ بنیاد پرست ہے۔ ساتھ ہی وہ یہ رائے بھی پیش کرتا ہے کہ اسلام کو ۲۰ ویں صدی کے تقاضوں کے تحت سیکولرزم کے مطابق ڈھالا جاسکتا ہے۔

اہل سیاست اور مسلمان

سیاست دانوں نے بھی گذشتہ برسوں میں مسلمانوں کے بارے میں اپنی رائے کو تبدیل کر لیا ہے۔ گذشتہ خوشگوار باتیں ' اب قصہ پارینہ ہیں۔ میڈیا مہم ' خفیہ رپورٹوں اور جرمن سفارت کاروں کی ارسال کردہ معلومات کی روشنی میں حکومت جرمنی کے تمام ارکان ' پالیسی ساز ' مشیر ' منصوبہ بندی کرنے والے سب ' اسلام کو ایک خطرہ تصور کرتے ہیں۔

چانسلر ہلمٹ کوہل کی سیکیورٹی پالیسی پر کانفرنس میں ایک اہم تقریر کے پیشگی متن کی بنیاد پر ' جو بعد میں تبدیل بھی کر دیا گیا ' سب سے بڑے اخبار Die Welt نے سرخیاں لگا دیں کہ چانسلر بنیاد پرستی کے خطرہ کو سنجیدگی سے لے رہے ہیں اور یورپ میں اسلامی توسیع پسندی کے مقابلے کے لیے تیار ہیں۔ خفیہ رپورٹوں کے مطابق بحیرہ روم کے ساحل پر بنیاد پرست اسلحہ کے انبار لگا رہے ہیں تاکہ یورپ کے مرکز میں مذہبی جنگ لڑی جائے۔ اس کے خلاف فرانس سے مل کر کارروائی کرنے کے بارے میں سوچا جا رہا ہے۔ ایک دوسرے اخبار کے مطابق ' کلنٹن سے کوہل کی ملاقات میں اسلامی دنیا کے امور سرفہرست تھے۔ دونوں رہنما اس پر متفق تھے کہ اسلامی بنیاد پرستی سے دوہرا خطرہ ہے ' شمالی افریقہ کی حکومتوں کو ' اور یورپ کی سلامتی کو۔

جرمن دستور اور اسلام

لیکن سیاسی نقطہ نظر سے ' سب سے زیادہ خطرناک بات تمام سیاسی پارٹیوں کی طرف سے اس رائے کا اظہار ہے کہ اسلام اور قرآن متحدہ جرمنی کے عارضی دستور The Grundgesets کے ساتھ نہیں چل سکتے۔ جرمنی کے ماہرین دستور نے اسلام پر تفصیلی بحث میں کہا ہے کہ قرآن کا عورتوں کو صحیح مقام نہ دینا ' شریعت کی قرون وسطی کی سزائیں ' مرتدین کے لیے اس کی سزائے موت اور کفار کے ساتھ اس کی عدم رواداری کی بنیاد پر کہا جاسکتا ہے کہ اسلام کو سرکاری طور پر تسلیم نہ کیا جائے۔ اگر یہ نقطہ نظر سرکاری پالیسی بن گیا تو جرمنی کے ۵ لاکھ مسلمانوں کے لیے جرمن شہری کی حیثیت سے اپنے

جائز حقوق حاصل کرنے کی کوششوں کو شدید نقصان پہنچے گا۔ اس کے اثرات ۵ لاکھ بچوں پر ہوں گے جنھیں ان کے مذہب کی تعلیم نہ دی جا سکے گی۔ اس وقت مسلمان بچوں کی اپنے اسکول میں اپنے مذہب کی تعلیم کا استحقاق حاصل ہے لیکن اگر ان کے نصاب' جرمنی کے آزاد جمہوری ڈھانچہ کے اصولوں کے مطابق نہ ہوں تو یہ سہولت واپس لی جا سکتی ہے۔ اس کے دیگر اثرات بھی ہوں گے۔ مساجد اور اسلامی مراکز کی تعمیر کی اجازت ملنے میں دشواری ہوگی۔ جرمن مسلمانوں کو ملازمت کے حصول میں مسائل پیش آئیں گے۔ اس کے علاوہ مسلمان گھروں اور دوکانوں کو جلانے اور لوٹنے کے واقعات' مساجد پر حملوں اور بم دھماکے جو اب بھی خبروں کا مستقل موضوع ہیں' بڑھ جائیں گے۔

سوشل ڈیماکریٹک پارٹی کے ایک اہم ممبر نے مطالبہ کیا ہے کہ جرمن سفارتکار کی حیثیت سے کام کرنے والے مسلمانوں کو واپس بلایا جائے۔ ڈاکٹر ولفرڈ مراد ہفمین سفیر ہیں' انھوں نے ایک کتاب اسلام ایک متبادل Der Islam as alternative لکھی ہے۔ اس ممبر نے ان پر بنیاد پرست نظریات رکھنے کا الزام لگاتے ہوئے انھیں واپس بلانے کا مطالبہ کیا۔

یہی وجوہات ہیں' اور اس پر تعجب نہ ہونا چاہیے' کہ کئی سیاستدان مسلمانوں کو یورپی یونین سے باہر رکھنا چاہتے ہیں۔ جرمنی کے ایوان زیریں میں قائد ایوان Wolfgang Schauble نے واضح طور پر کہا ہے کہ یونین کی ممبرشپ غیر عیسائیوں کے لیے نہیں ہے۔ یورپ کے افق پر چرچ کے spiral ہیں نہ کہ مسجدوں کے مینار۔

چہ باید کرد

اس صورت حال میں' جرمنی کے مسلمان عدم تحفظ کا شکار ہیں۔ میڈیا انھیں ففتھ کالمنسٹ قرار دے رہے ہیں اور جرمن معاشرہ کی ایک محدود متجدد پسند اقلیت مسلمانوں کے خلاف نفرت کی مہم چلا رہی ہے۔ مسلمان خود کو اس کا مقابلہ کرنے کے' یا اس کے محض اثرات دور کرنے کے بھی قابل نہیں پاتے۔ اس سے احساس عدم تحفظ میں مزید اضافہ ہوتا ہے۔ مسلمانوں کی میڈیا میں اپنی بات کہنے کی کوششیں بار آور نہیں ہوتیں۔ بس ہیمبرگ اور Tubingen کی یونیورسٹیوں کے چند اہل علم' مسلمانوں کے حق میں انصاف کا پرچم اٹھائے ہوئے ہیں۔

یہ ضروری نہیں کہ یہ سب کچھ کسی سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ہو رہا ہو اور کسی ایک جگہ سے تار ہلائے جا رہے ہوں۔ اصل وجہ بڑے پیمانے پر ناواقف ہونا اور سچ معلوم کرنے کے لیے کسی مضبوط داعیہ کا نہ ہونا ہے۔ اس وقت بھی مختلف سطحوں پر جرمن مسلمان اور عام جرمنوں میں خوشگوار تعلقات قائم ہیں۔ سیاسی قائدین میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو مسلم دشمن خیالات نہیں رکھتے۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ مختلف ذرائع اختیار کر کے 'اور وسائل فراہم کر کے 'اسلام کی حقیقی دعوت کا موثر طور پر ابلاغ کیا جائے۔ سید مودودی ؒ نے فرمایا تھا کہ دشمن جب ہمارے خلاف پروپیگنڈہ کرتا ہے 'تو آدھا کام تو کر دیتا ہے۔ ہمارا نام پہنچ جاتا ہے اور ہمیں پہنچ کر صرف اپنا صحیح تعارف کروانا ہوتا ہے۔ شاید جرمن معاشرہ میں 'یورپ کے موجودہ حالات اور موجودہ عالمی پس منظر میں یہ اتنی آسان بات نہیں 'لیکن حالات کی بہتری کی صورت یہی ہے کہ ایک طرف جرمنی میں موجود مسلمان اپنی ابلاغی طاقت میں اضافہ کریں اور دوسری طرف عالم اسلام بھی اسلام کی بہتر اور حقیقی تصویر پیش کرے۔ مغرب کے ذرائع ابلاغ کو ہم کچھ بھی کہیں لیکن جب وہ مسلمانوں کے خلاف مہم چلاتے ہیں تو وہ سو فیصد جھوٹ نہیں ہوتی۔ کچھ لوازمہ آج کے مسلمان بھی فراہم کرتے ہیں۔ مسلمان ملکوں میں غلبہ اسلام کے لیے کام کرنے والوں کو بھی اس پہلو کو پیش نظر رکھنا چاہیے کہ آج کے عالمی گاؤں میں ' ہر خبر اور ہر واقعہ ' ہر جگہ ردعمل رکھتا ہے۔

اس مضمون کی تحریر میں درج ذیل سے مدد لی گئی ہے۔

1- Jorgen Nielsen, Muslims in Western Europe, Edinburgh: Edinburgh University, 1992

2- Ahmad Von Denffer, Paper read at the Islam in Europe Conference, Islamic Foundation, Leicester 5 SEP, 92

3- Aman Hobbom, Special relationship flawed by misperception, the Impact International, london, Vol 25, No.1, Jan 1995.

یورپ میں فلسفۂ سائنس کا ارتقا

پروفیسر عبد القدیر سلیم

جدید فلسفے کی ابتدا

یورپ میں جدید فلسفے کا ارتقا عموماً فرانسیسی مفکر رینے ڈیکارٹ (Ren'e Descartes) کے نام سے ہوتا ہے۔ وہ ۱۵۹۶ء میں پیدا ہوا۔ یورپ کی تب کی جامعات میں فلسفہ، نحو، علم الکلام، دینیات، قانون اور ریاضی کی تعلیم حاصل کی۔ بقول شخصے اپنی تعلیم کی تکمیل کے لیے اس نے پیشہ سپہ گری بھی اختیار کیا۔ کہتے ہیں کہ اوائل عمری میں اس نے خواب دیکھا تھا کہ ''صداقت کی روح'' تمام علوم کے خزانے اس پر منکشف کر رہی ہے۔ ہالینڈ کے قیام کے دوران اس پر یہ منکشف ہوا کہ الجبرا، جیومیٹری اور عمومی طور پر ریاضی کے طریق سے تمام مسائل کی تھی سلجھائی جا سکتی ہے۔ وہ یورپ کی مشہور تیس سالہ جنگ (۱۶۱۸-۴۸) کے ایک معرکے میں بھی شریک تھا۔ اس جنگ نے جرمنی کو تباہ و برباد کر ڈالا تھا۔ اور اس میں یورپ کے بیشتر ملک تمام تر مذہبی دھڑے بندیوں کی بنا پر شریک ہو گئے تھے۔ مذہبی آزاد خیالی، رومی کیتھولک کلیسا کی جکڑ بندیوں کے خلاف ایک احتجاج کے طور پر شروع ہوئی تھی۔ جس نے پروٹسٹنٹ فکر کے نام پر باقاعدہ ایک مذہبی فرقے کی صورت اختیار کر لی تھی۔ یورپ کے جو بادشاہ اور نواب پوپ اور کلیسا کے روز افزوں دباؤ اور جکڑ بندیوں سے عاجز ہو گئے تھے۔ انھوں نے اس ''نئے مذہب'' میں پناہ لی تھی، اور اسی سے مذہبی، سیاسی آویزشیں شروع ہوئی تھیں۔

ڈیکارٹ اس جنگ میں صرف ایک معرکے ہی میں موجود تھا۔ اس کے بعد اس نے فوج کو خیرباد کہا اور اپنے طور پر یورپ کی سیاحت کی۔ کچھ عرصہ اس نے فرانس میں گزارا۔ لیکن پھر اس نے ہالینڈ میں اپنے خیالات کے پرچار کی زیادہ آزادی دیکھی، اور وہاں چلا گیا۔ وہاں اس نے انعطاف نور پر تجربے کیے، بصریات پر مقالے لکھے، اور طبیعیات پر اپنے مطالعے کو قلم بند کیا۔ لیکن جب اسے پتہ چلا کہ گیلی لیو کے نظریہ حرکتِ زمین کی بنا پر کلیسائی عدالتِ تحقیق نے اس کی مذمت کی ہے، تو اس نے اس مطالعے کو شائع کرنا مناسب نہ سمجھا۔ یہیں اس نے اپنے فلسفیانہ طریق پر مشہور کتاب Discourses

on Method لکھی' اور پھر Meditations on First Philosophy شائع کی۔ ان کتابوں میں اس نے درست علم کے ذرائع اور ان کی تنقیح سے بحث کی ہے۔ ۱۶۴۹ء میں سویڈن کی ملکہ کرسٹینا نے اسے اپنے ہاں مدعو کیا کہ وہ سویڈن میں رہے' اور اسے فلسفہ پڑھائے۔ وہ ایک علم دوست خاتون تھی۔ وہیں ۱۶۵۰ء میں ڈیکارٹ کا انتقال ہوا۔

ڈیکارٹ کی زندگی کے اس مختصر سے خاکے سے سترھویں صدی کے وسط میں یورپ کی عمومی ذہنی و علمی فضا کا ایک ہلکا سا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ خانہ جنگیوں اور خلفشار کے باوجود روز مرہ کے مسائل اور فکر امروز سے ہٹ کر کتب خانوں اور معمل میں یکسوئی کے ساتھ علمی کام اور تحقیق کرنے والے اور کائنات و مافیہا پر غور کرنے والے بھی موجود تھے' اور ان کے سرپرست اور بہت سے مقتدر بھی ان مسائل میں دلچسپی رکھتے تھے' ایسے مسائل جو عملی سیاست سے تعلق نہیں رکھتے۔ اور پھر یہ ایسے مشاغل تھے جو خیال آفرینیوں اور کلام موزوں سے کچھ الگ قبیل کے تھے' جب کہ برصغیر اور دیگر ایشیائی تہذیبوں میں صلاحیتوں کی ترک و تاز اور ہی سمتوں میں ہو رہی تھی۔

ڈیکارٹ کا عہد (۱۷ویں صدی کا نصف اول) روایتی کلیسائی علم الکلام (Scholasticism) کی شکست و ریخت اور نشاۃ ثانیہ کے نتیجے میں تجرباتی علوم (سائنس) کے آغاز کا دور تھا۔ ولیم آف آکم (م ۱۳۴۹) نکولاس کوپرنیکس (م ۱۵۴۳) فرانسس بیکن (م ۱۶۲۶) تھامس ہابس (م ۱۶۷۹) جسے اس کے بعض چاہنے والوں نے "کامل دہریئے" کا خطاب دیا تھا' چرچ کی روایتی فکر کے بندھن توڑ چکے تھے' اور مشاہدے' تجربے اور (اپنی عقل کے مطابق) عقلی استدلال کی روشنی میں نئی سوچ کی طرح ڈال چکے تھے۔ نئی یورپی فکر کا آغاز دو منفرد اور یکتا دھاروں سے ہوا۔ عقلیت (Rationalism) اور تجربیت (Empiricism)' دونوں نے حقیقت کی تلاش' روایت سے ہٹ کر کرنے کی کوشش کی۔ ڈیکارٹ نے اپنی قوت عقلیت کی فکری رو کو مہمیز کرنے میں صرف کی' اگرچہ اس کے نظام میں افلاطونی عنصر کی جھلک بھی نمایاں نظر آتی ہے۔ ڈیکارٹ اور اس کے پس روؤں (اسپائی نوزا' لائی بنز) نے مذہب اور کائنات کی غائی حقیقت ---- خدا ---- کے تصور کو خیرباد کہے بغیر' سائنسی فکر کو ان کے مطابق بنانے کی "عقلی" کوشش کی۔ اس طرح انھوں نے کائنات کے ایک ایسے تصور تک رسائی کی کوشش کی' جو سائنس کی (مزعومہ) صداقتوں کے ساتھ ہم آہنگ بھی ہو' اور اس میں مذہب و اخلاق کے لیے جگہ بھی ہو۔

مستحکم علمی بنیاد کی تلاش

ڈیکارٹ کا بنیادی مسئلہ علمیاتی تھا۔ یعنی یہ کہ یقینی علم کس طرح حاصل ہو سکتا ہے' اس کے یقینی

ہونے کا معیار کیا ہے؟ کسی شے (یا قضیے ' دعوے ' بیان) کے ثبوت کے لیے ہم کیا دلائل لا سکتے ہیں اور اس شے کا وجود کس طرح ہمارے لیے یقینی ہے۔ اس نے کہا کہ ہمیں تمام ظن و قیاس ' دعووں تمام ایمانیات اور "قطعی حقیقتوں" کو خیرباد کہہ دینا چاہیے اور کھلے ذہن سے ایک صاف تختی لے کر تلاش علم کا آغاز کرنا چاہیے۔ فلاں نے یہ کہا تھا' افلاطون کی یہ رائے تھی ' ارسطو یہ کہتا تھا' پوپ صاحب یہ فرماتے ہیں' بڑے سائنس دان (اور فلسفی) اس بات کے قائل ہیں' سب کو چھوڑ دیجیے ۔ خاص طور پر ان تعصبات اور عقائد کو جو بچپن سے ہمارے ذہنوں میں راسخ کرائے جاتے ہیں۔ اب دیکھیں کہ صداقت ہے کیا؟

ہم کہہ سکتے ہیں کہ جو باتیں بدیہی ہیں ' (بہ مقابلہ ان باتوں کے جو محض ظنی اور قیاسی ہیں)' ان کے بارے کہا جا سکتا ہے کہ وہ یقیناً درست ہیں۔ اب مذہب کی صداقتیں (وجود الٰہی ' آخرت اور "ایمان بالغیب" قسم کی دوسری باتیں) تو بدیہی نہیں۔ ہم کیوں کر کہہ سکتے ہیں کہ وہ یقیناً "ہیں"۔ ان کے بارے میں تو شک کیا جا سکتا ہے۔ یقیناً یہ بدیہی صداقتیں نہیں ہیں' لیکن ہمارے حسی ادراکات کی بچھائی ہوئی ساری بساط بھی تو یقینی نہیں۔ ممکن ہے حسی ادراکات کے معطیات' یعنی حواس کے ذریعے ہمارے علم میں آنے والی ساری اشیا بھی اسی طرح "خیالی" اور غیر حقیقی ہوں' جیسے واردات خواب' التباس (illusion) اور واہمے۔ جب ہم خواب دیکھ رہے ہوتے ہیں' تو اس کے سارے واقعات' ظروف اور اشیا ہمیں حقیقی محسوس ہوتی ہیں' مگر جب بیدار ہوتے ہیں تو کچھ نہیں ہوتا۔

تھا خواب میں خیال کو اس سے معاملہ جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا

اس امکان کو قطعیت کے ساتھ کیسے رد کیا جا سکتا ہے کہ کوئی شریر شیطانی قوت ہمیں وہ کچھ دکھا رہی ہو جو نہیں ہے' اور وہ محسوس کرا رہی ہو جس کی کوئی حقیقت نہیں۔ اگر ایسا ہے' تو پھر ایک سچے اور عادل خیر خدا (یزداں؟) پر بھی ہمارا عقیدہ متزلزل ہو جاتا ہے' کیوں کہ خدا تو اپنے بندوں کو فریب نہیں دے سکتا۔ پھر یہ طلسم سامری اور نظر بندی کا پاکھنڈ اس کی فریب کاری نہیں ہو سکتی۔ اس لیے خدا پر بھی شک ہے۔ لیکن کیا ریاضی کی صداقتیں ہر قسم کے شک و شبہ سے بالا نہیں ہیں؟ دیکارٹ کہتا ہے کہ مجھے اس میں بھی شک ہے' کیوں کہ ہو سکتا ہے کہ کسی شریر شیطان نے ہمارے اذہان کو اس طرح مغلوب کر لیا ہو کہ جسے ہم ریاضی کی اٹل صداقتیں تصور کرتے ہیں' فی الواقع وہ یوں نہ ہوں' بلکہ ناصواب "غلط فہمیاں" ہوں' جن کا سراغ لگانا ہمارے بس میں نہ ہو' اور آخر پتہ چلے (یا پتہ بھی نہ چلے) کہ ' خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا' جو سنا افسانہ تھا!

اس طرح ' دیکارٹ کہتا ہے' میں درخت اور پہاڑ' زمین اور آسمان' مخلوق اور خالق ' ہر شے کے

حقیقتاً موجود ہونے پر شک کر سکتا ہوں اور کوئی چیز بھی اس عمل تشکیک کی زد سے باہر نہیں رہتی۔ مگر میں یہ شک نہیں کر سکتا کہ میں شک کر رہا ہوں 'کیوں کہ شک کرنے پر شک کرنا بھی تو شک کرنا ہی ہے۔ گویا یہ ایک بات ہے جس پر شک نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ایک یقینی بات ہوئی۔ اب صورت یہ ہے کہ "شک کرنا" ایک فکری عمل ہے 'ایک سوچ ہے۔ گویا یہ بات شک و شبہ سے بالا ہے کہ میں سوچ رہا ہوں۔ لیکن سوچنے کے لیے لازم ہے کہ کوئی سوچنے والا بھی ہو۔ اس طرح وہ اپنے وجود کا اثبات کرتا ہے: "میں سوچتا ہوں 'اس لیے میں (وجود رکھتا) ہوں"۔

دریائے شک کے تند و تیز دھارے میں بے بسی کے ساتھ بہتے اور ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے اس کا ہاتھ ایک محکم چیز پر پڑ گیا تھا۔ وہ سارے انسانوں کو 'دنیا و مافیہا کو 'ایک نظربندی 'واہمہ اور طلسم بے حقیقت تصور کر سکتا ہے 'مگر اس طلسم کی شکار اپنی ذات پر شک نہیں کر سکتا۔ لیکن بقول ڈیکارٹ 'اس سوچ نے اسے ایک اہم اصول بھی دے دیا: ایک قضیہ 'منطقی جملہ (یا سوچ) اس وقت درست سمجھا جائے گا 'جب وہ اسی طرح بدیہی اور ناقابل تردید ہو جیسے یہ بات کہ سوچنے کے لیے ایک سوچنے والا چاہیے۔ یہ ڈیکارٹ کا "انقلابی طریق" تھا: ہمیں اپنے ذہن کا علم براہ راست ہوتا ہے 'جب کہ دوسری چیز کا علم بالواسطہ ہوتا ہے۔ اس لیے میں اپنے ذہن (اور اپنے وجود) پر شک نہیں کر سکتا۔ اسی طرح ہمیں یہ بھی مان لینا چاہیے کہ جن چیزوں کا تصور ہمارے ذہن میں ہے 'ان تصورات کو جنم دینے والی چیزیں بھی موجود ہوں گی۔ میرے ذہن میں ایک کامل ہستی کا تصور ہے 'جو علیم و خبیر کل 'قدیر' واجب الوجود اور ازلی و ابدی ہے۔ چوں کہ یہ میری صفات نہیں 'لہٰذا میں ان کا باعث نہیں ہو سکتا۔ ان صفات سے متصف کوئی ہستی ضرور ہونی چاہیے۔ وہی خدا ہے۔ اب اگر یہ خدا 'خدائے خیر ہے۔ (خدائے شر یا شیطان نہیں) تو وہ یقیناً فریب کار نہیں ہو سکتا کہ ساری دنیا اور کائنات کا طلسم محض ایک فریب نظر کے طور پر کھڑا کر دے۔ اس طرح ڈیکارٹ نے ان تمام چیزوں کا اثبات کیا 'جن پر وہ پہلے شک کر رہا تھا۔

خدا، ذھن اور مادہ

ڈیکارٹ کے نزدیک خدا چوں کہ ازلی اور ابدی ہے 'وہ کسی اور چیز سے وجود میں نہیں آیا 'اس لیے وہ ایک "جوہر" ہے یعنی substance۔ جوہر وہ شے ہے جو اپنے وجود سے قائم ہو 'اور اس کے وجود کا دارومدار کسی اور شے پر نہ ہو۔ خدا کے علاوہ 'وہ دو اور جوہروں کا قائل تھا۔ یہ اضافی اعتبار سے جوہر ہیں 'یعنی اگرچہ خدا کی تخلیق ہیں لیکن ایک کی تحویل دوسرے میں نہیں ہو سکتی 'بلکہ دونوں ایک دوسرے سے بالکل الگ اور قائم بالذات ہیں۔ یہ دو جوہر ہیں: ذہن (mind) اور مادہ

(matter) ۔ کائنات و مافیہا اپنے مواد کے اعتبار سے انھی جوہروں سے مرکب ہے ' ان دونوں میں کوئی بھی ابتدائی اور ثانوی نہیں ۔

ذہن ' حقیقتاً ایک سوچنے والا جوہر (thinking substance) ہے ' اور مادہ ' ایک جوہر بسیط (extended substance) ۔ ذہن کا اپنا الگ وجود ہے ' اور وہ اس کے لیے کسی مادی جسم کا محتاج نہیں ۔ اسی طرح مادی جوہر بھی موجود بالذات ہے 'یعنی خود اپنے طور پر موجود ہے ۔ ذہن اور مادے کی اس ثنویت سے اوپر وہ خدا کے وجود کو تسلیم کرتا ہے ' اور جیسا کہ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں ' اسے وہ ان دونوں کا خالق مانتا ہے ۔ تاہم اس نے دعویٰ کیا کہ کائنات اپنی اصل کے اعتبار سے مادی ہے ' اور کمیت اور ریاضی کے ذریعے ہی اس کی تفہیم ہو سکتی ہے ۔ (یہ امر دلچسپی کا باعث ہو سکتا ہے کہ پہلی حاسب مشین (calculator) کی تخلیق کو ڈیکارٹ ہی سے منسوب کیا جاتا ہے) تاہم اس کا خیال تھا کہ مادہ اصلاً غیر متحرک اور بے جان ہے ' اس میں حرکت اولاً انگشت خداوندی ہی سے پیدا ہوئی ۔ لیکن اب کائنات اپنے فطری اور طبعی قوانین کی پابند ہے ' اور اس میں خدا کی کسی دخل اندازی کی ضرورت نہیں ۔ اور پھر خدا کو ذہن و مادے کا خالق تسلیم کرنے سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ خالق اور مخلوق ایک دوسرے سے علیحدہ ہوں ۔ (خالق اپنی مخلوق کا عین کیوں کر ہو سکتا ہے ؟) انسانی روح (یا ذہن) کے علاوہ ساری طبعی کائنات یا کل فطرت اپنی نہایت کے اعتبار سے مادے اور حرکت پر مشتمل ہے ۔ عالم طبعی کے واقعات و حوادث ' طبعی اسباب و علل کا لازمی نتیجہ ہوتے ہیں ۔ گویا عالم مادی میں واقعاتی جبریت پائی جاتی ہے ۔ حیوانات 'بلکہ انسانوں کے جسم بھی ان قوانین فطری کے پابند ہیں ' اور ان سے سرِ مُو بھی تجاوز نہیں کر سکتے ۔ حیوانات ' دراصل خود کار مشینیں ہیں ' اور ان کی حرکات و سکنات طبعی مشینی اعمال سے زیادہ اور کچھ نہیں ۔ (جب ڈیکارٹ نے ملکہ کرسٹینا کو اس بات کا قائل کرنے کی کوشش کی کہ حیوانی افعال ' مشینی افعال سے زیادہ کچھ نہیں 'کیوں کہ حیوان پے چیدہ مشینوں سے بڑھ کر کچھ نہیں ۔ جنھیں ہم شعور اور روح کے وظائف کہتے ہیں ' وہ مشینی حرکات ہی ہیں ' تو ملکہ نے کہا کہ میں نے تو کبھی اپنی گھڑی کو ننھی گھڑیوں کو جنم دیتے نہیں دیکھا !)

انسان ، حیوان اور مشین

تاہم ڈیکارٹ اس بات کا قائل تھا کہ انسان ' مادی جسم کے ساتھ ساتھ ' روح (یا ذہن) بھی رکھتا ہے ۔ حیوانات ' مشینوں کی طرح ' مجبور محض ہیں ' لیکن ذی روح ہونے کی بنا پر انسان ان کی طرح پابند نہیں 'بلکہ آزاد و مختار ہے ' اگرچہ یہ آزادی ' مطلق آزادی نہیں ۔ مطلقاً آزاد تو صرف خدا ہی ہے ۔ انسان کی آزادی ارادہ یہ ہے کہ وہ کسی چیز کو خیر اور کسی کو شر تصور کر سکتا ہے 'کسی کو منظور اور کسی کو

نامنظور کر سکتا ہے۔ اچھے برے کی تمیز کے ساتھ ہی افعال کی جواب دہی کا تصور بھی وابستہ ہے۔

ڈیکارٹ نے اس طرح انسان کو حیوان سے ممتاز تو کر دیا، لیکن جس راہ پر وہ چل پڑا تھا اس کا تقاضا تھا کہ انسان کا یہ امتیازی رتبہ ختم کر دیا جائے اور ہم دیکھیں گے کہ مغرب میں حیاتی، کیمیائی اور طبعی علوم کی پیش رفت کے ساتھ ساتھ یہ تمیز فی الواقع ختم کر ہی دی گئی۔ نفسیات نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ دوسرے حیوانات کی طرح انسانی کرداری تفہیم (اور تبدیلی بھی) مہیجات (یعنی کسی زندہ جسم یا عضویے پر اثر ڈالنے والی چیزیں) اور ان کے نتیجے میں ظہور میں آنے والے ردعمل کے ذریعے کی جا سکتی ہے۔ آپ کو سردی لگتی ہے تو آپ سکڑ جاتے ہیں، انگلی میں سوئی چبھ جائے تو آپ فوراً ہاتھ ہٹا لیتے ہیں۔ اسی طرح مہیج عضویہ۔ ردعمل کے اس فارمولے کے مطابق آپ کا کردار بھی ایک خودکار مشین کا سا کردار ہے، جو اپنی مخصوص ساخت کے زیر اثر مخصوص عمل اور ردعمل کی پابند ہے۔

ڈیکارٹ نے خدا، روح انسانی اور عالم مادی کا اقرار کیا۔ اپنے ہم عصروں میں وہ ایک پکا عیسائی مومن اور پرجوش کیتھولک باور کیا جاتا تھا، مگر کیا فی الواقع وہ ایسا ہی تھا؟ ول ڈیوران کو اس میں شک ہے (۱)۔ شاید اس کی پکی مذہبیت ایک پردہ تھی، اور اس کی عقل پرستی اور تجرباتی دلچسپیاں اسے کسی اور ہی سمت میں لے جا رہی تھیں۔ ایک طرف تو اس نے کہا کہ "عقل ہمیں ان بنیادی عقائد پر ایمان رکھنے سے نہیں روکتی، جو الہامی طور پر ہم پر منکشف ہوئے ہیں، اور ہمارے یقینی علم سے بھی زیادہ یقینی ہیں"۔ اور دوسری طرف اس کا خیال تھا کہ سائنس، تجربی طریق، ریاضی اور شماریاتی منہاج اور کمیاتی توجیہات (quantitative explanations) بالآخر قرون وسطیٰ کے دھندلکوں میں لپٹے ہوئے نیم پختہ نظریات اور قیاس آرائیوں کو میدان سے بھگا دیں گے، اور سائنس کی مدد سے انسان "فطرت کا مالک و مختار اور آقائے مطلق بن جائے گا"۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے خدا اور مذہب کو مادیت کی یلغار سے بچانے کی کوشش کی، اور مادے کے ساتھ روح کو ایک الگ جوہر تسلیم کر کے دونوں کو خدا کی مخلوق اور متنوع باور کرانے کی کوشش کی۔ یہ برٹرینڈ رسل کا نقطہ نظر ہے (۲)۔

مگر اس سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ جب اس نے حیوانات کو طبعی اور فطری قوانین کے تحت کام کرنے والی جاندار (مگر بے روح، بے ذہن) مخلوق قرار دے ہی دیا، تو یہ دعویٰ کمزور پڑ گیا کہ انسان، جوہری طور پر حیوانات سے مختلف ایک مخلوق ہے، جو روح اور ذہن کی مالک ہے۔ انسان بھی ایک حیوان ہی ٹھہرا، اگرچہ زیادہ ترقی یافتہ۔ یہ کیوں نہ مان لیا جائے کہ دونوں میں وہی فرق ہے، جو ایک سادہ اور ایک پیچیدہ مشین میں ــــ مثلاً ایک ابتدائی سادہ کمپیوٹر اور ایک ترقی یافتہ کمپیوٹر میں نظر آتا ہے۔ کیوں نہ یہ مان لیا جائے کہ انسان بھی ایسے "خودکار" ہیں، اور محض مخصوص مہیجات پر

رد عمل کی صلاحیت رکھنا اس امر کی دلیل نہیں کہ وہ نوعی اعتبار سے مختلف صلاحیت کے حامل ہوں۔ آخر ہم یہ تو نہیں کہتے کہ ہمارا کمپیوٹر سوچ اور فکر کا حامل ایک ذی شعور اور برتر مخلوق ہے۔ جب کہ ابتدائی قسم کا حاسب محض ایک مشین ہے۔ شاید اس نے انسانوں کو حیوانات سے ممیز اس لیے کر دیا کہ وہ "شرف انسانیت" سے نہ گر جائیں۔ اس نے الحاد تو اختیار نہ کیا' لیکن اس کے نظام کائنات میں خدا کی کوئی ضرورت بھی نہ تھی کہ سارے کام اس کے بغیر ہی ہو رہے تھے۔ یہ ڈیکارٹ کا وہ روپ ہے' جس میں وہ انیسویں / بیسویں صدی کے فلسفۂ سائنس کا محرکِ اوّل قرار پاتا ہے۔

اسپائی نوزا کی توحید

اسپائی نوزا (۷۷-۱۶۳۲) ڈیکارٹ کی طرح تجرباتی سائنس میں منہمک فلسفی اور شہرت و کروفر کا مالک دانش ور نہیں تھا' گو اس کا باپ ایک متمول اور بااثر کاروباری یہودی تھا' جو ہسپانیہ میں یہودیوں کے خلاف عیسائیوں کے غیظ و غضب سے بچنے کے لیے ہالینڈ جا کر بس گیا تھا۔ اسپائی نوزا کی ابتدائی تعلیم یہودی کلیسا میں ہوئی' لیکن اس کی گہری مذہبیت اسے یہودیت کے تصورِ الہ کو قبول کرنے پر آمادہ نہ کر سکی۔ اس کا خیال تھا کہ یہ تصور انسان کے اپنے پیکر پر مبنی خدا کا تصور ہے۔ ایک ایسا خدا' جو انسان جیسا ہی ہے' مگر بے حد قوت والا' انتہائی علیم و خبیر' کامل و مکمل اور لامتناہی۔ مگر دوسری طرف اسے کائنات بھی لامتناہی نظر آئی۔ اب دو لامتناہی وجود تو بیک وقت موجود نہیں ہو سکتے۔ اس کا حل اس نے یہ نکالا کہ کائنات اور خدا کو ایک کر دیا۔ بہت سے مسلم صوفیا اور مفکر اس سے پہلے اس طرح کی "توحید" کا پرچار کر چکے تھے۔ ابن العربی (م ۱۲۴۰) کا وطن ہسپانیہ تھا (جو اسپائی نوزا کا بھی آبائی وطن تھا)' اور وہاں ان کے وحدت الوجود کے فلسفے کا یقیناً چرچا رہا ہوگا' جس کے مطابق اللہ ساری کائنات میں جاری و ساری ہے' اور یہ کائنات اسی کا ایک اظہار ہے۔ اسپائی نوزا کے مطابق کائنات میں ایک نظم اور انحصار باہمی نظر آتا ہے۔ "اسباب و علل کا سلسلہ ایک دوسرے میں پیوست ہے"۔ درحقیقت تمام موجودات اور ان کے اسباب' ان کا مجموعہ ہی "کائنات" ہے۔ یہ سب مل کر ایک اکائی بنتے ہیں۔ ان کا باہم مربوط ہونا ضروری ہے' کہ کائنات میں ایک وجود دوسرے کا باعث ہوتا ہے' اور دوسرا' پہلے کا' بلکہ سب کا۔ چوں کہ فطرت (nature) ایک وحدت ہے' اس لیے اس کے ہر جزو میں وہ تغیر واقع ہو رہا ہے' وہ دوسرے اجزا کے باعث ہے' اور خود بھی مجموعۂ علل کا ایک حصہ ہے۔ اس طرح دیکھیں تو کائنات ایک "مجموعہ اجزا" نہیں' بلکہ ایک کل نظر آتی ہے' جس کے تمام اجزا فی الحقیقت "اعضائے یک دیگر اند"۔

وحدت الوجود روحانی اور مادیتی

یہ اسپائی نوزا کا ''وحدت الوجود'' ہے۔ جو کچھ ہے 'وہ خدا ہے۔ ہم خدا سے جدا نہیں۔ ساری کائنات اپنے حوادث اور اجزا سمیت ایک ازلی اور ابدی جوہر (substance) ہے۔ فانی اشیا اور گزرتے ہوئے حوادث و واقعات اسی ایک لامتناہی وجود کی بوقلمونیاں ہیں۔ اہل دینیات اور علمائے دین نے خدا کو کائنات سے علیحدہ ایک خالق و مالک اور مقتدر مطلق ہستی کا رتبہ دیا' اسپائی نوزا نے خالق و مخلوق کی دوئی ختم کر کے ''احدیت'' کا وہ فلسفہ پیش کیا' جس میں دہریت اور توحید' مادیت اور ہمہ اوست' کائنات اور خدا کو یک جان (دو قالب؟) کر دیا گیا تھا۔ اس فلسفے نے مغربی فکر کی تاریخ میں دو بالکل متضاد دھاروں کو جنم دیا۔ روحیت کا دھارا اور مادیت کا نظام۔ شیلنگ (Schelling: ۱۷۷۵-۱۸۵۴) اور ہیگل (Hegel: ۱۷۷۰-۱۸۳۱) نے اپنے وجود مطلق کے فلسفے میں کائنات کو روح الاصل قرار دیا۔ فطرت اشارہ دیتی ہے کہ اس کے پیچھے ذہن کارفرما ہے۔ ہیگل نے یہ خبر دی کہ مطلق (Absolute) کی سب سے مجرد تعریف یہ ہوگی کہ وہ ''موجود'' ہے'' (ہست: Being)' اور اس کے بارے میں کم سے کم جو کہا جا سکتا ہے 'وہ یہ ہے کہ وہ ''ہے''' بغیر اس کے کہ اس کی کچھ امتیازی صفات (خصوصیات) ہوں۔ دوسرے الفاظ میں وہ ایک وجود (؟) ہے بلاصفات (ابن العربی کا ''عمیٰ'')۔ مگر امتیازی خصوصیات کے بغیر محض ہونا' دراصل نہ ہونا یا نیستی یا لاشے (Nothing) ہونا ہے۔ اس طرح مطلق میں ''ہست'' اور ''نیست'' دونوں اضداد جمع ہیں' اور اپنی اضداد کے تعامل سے وجود کا ارتقا ہوتا ہے۔ اس طرح وجود مطلق ایک ارتقائی تصور ہے۔ تصوریت کے اس دھارے میں بعد میں بریڈلے (م ۱۹۲۴)' بوزلنکے (م ۱۹۲۳)' کروچے (م ۱۹۵۲) پیدا ہوئے۔

احدیت کی دوسری شکل نے بے خدا مادیت کا روپ اختیار کیا' اور اس میں ہولباخ (م ۱۷۸۹) فوائر باخ (Feuerbach' م ۱۸۷۲)' کارل مارکس (م ۱۸۸۳) مشہور ہوئے۔ آخر الذکر نے احدیت کے اس فلسفے کی تشکیل اور ترقی جدلی مادیت اور اشتراکیت کی حیثیت سے کی جس کے بیسویں صدی کی تاریخ پر بڑے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔

لیکن فی الحال ہماری دلچسپی کائنات کے اس وحدانی تصور سے ہے' جسے سولھویں / سترھویں صدی میں یورپ میں فروغ حاصل ہو رہا تھا۔ کلیسا' پروٹسٹنٹ اور کیتھولک دو فرقوں میں تقسیم ہو چکا تھا' اور دونوں فرقوں کے ماننے والے اپنی اپنی ریاستوں اور علاقوں میں مقتدر تھے۔ ان کی آویزش اپنی جگہ تھی' لیکن آزاد خیال' منکر اور مذہب بے زار ''دانش ور'' اس لڑائی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مذہب اور خدا ہی کو کائنات سے بے دخل کیے دے رہے تھے۔ (یہ وہ منظر ہے جو گزشتہ ایک صدی

سے ہمارے ملک اور پوری مسلم دنیا میں بطلیموسی کاوش کے صاف دیکھا جا سکتا ہے)۔ پولش عالم فلکیات کوپرنی کس (م ۱۵۴۳) نے یہ دعویٰ کر دیا تھا کہ زمین ساکن نہیں (جیسا کہ عیسائی مذہب کے علما یقین رکھتے تھے) بلکہ متحرک ہے' اور سورج کے گرد گردش کرتی ہے۔ کائنات وسیع ہو گئی' تو کرۂ ارض ایک بے حقیقت ذرہ بن کر رہ گیا۔ اس کائنات میں انسان اور انسانی اداروں کی کیا حیثیت تھی؟ کچھ بھی نہیں۔ پھر یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے بیٹے یسوع مسیح کو کیوں انسانیت کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیا' یا کیوں خود مصلوب ہونے کے لیے دنیا پر اتر آیا؟ اس طرح کے سوالات نے مذہب کی کیاریوں پر تیزابی بارش کا کام کیا' اور وہ مرجھانے اور سوکھنے لگی۔ پھر جب گیلی لیو نے اپنی دوربین چاند کی طرف پھیری اور وہاں اسے کرۂ ارض کی طرح سطوح مرتفع' پہاڑ اور وادیاں نظر آئیں' تو بقول برٹ آن لے پل یار: جدید سائنس کا افتتاح ہو گیا (۳)۔ (جاری)

۱۔ دیکھیے ص ۶۳۱ The Story of Civilization The Age of Reason Begins

۲۔ Understanding the Present

۳۔ ح م ب ص ۶۵

مغرب کے معصوم بچے

عبد الغفار عزیز

مغرب میں لبرلزم نے خواہشات نفس کے ذریعے لذت حصول کو انسانی زندگی کا مقصد قرار دیا اور اپنی زندگی اور جسم پر اختیار کو عورت کی آزادی اور نجات کا چارٹر۔ چنانچہ خاندانی زندگی تیزی سے منتشر و منہدم ہونے لگی اور جنسی بے راہ روی کا ایک سیلاب امنڈ آیا۔ ابلاغ عامہ کے ذرائع کی طرف سے ہر قسم کی فحاشی اور تشدد کی بے محابا اشاعت اور ترغیب نے دو آتشہ کا کام کیا۔ اس کی زد سب سے بڑھ کر بچوں پر پڑی۔ ٹوٹے پھوٹے طلاق زدہ گھر، ماں باپ کے گھر، ٹی وی اور دیگر میڈیا --- ان سب نے ایک طرف ننھے منے بچوں کو سنگین مجرم بنا دیا اور دوسری طرف خود بچوں کے خلاف ناقابل تصور جنسی اور تشدد کے جرائم میں بے تحاشہ اضافہ کر دیا۔ یہ ایک وسیع موضوع ہے جس کے صرف ایک گوشہ کی جھلک درج ذیل مختصر سے مضمون میں دیکھی جا سکتی ہے جو المجتمع، کویت سے ماخوذ ہے۔ (مدیر)

مغرب کی ظاہری چکاچوند کے پیچھے کیا کیا فساد و بگاڑ چھپا ہوا ہے۔ اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے آیئے چند ایک یورپی ممالک کے بچوں کے خلاف اور خود ان کے جرائم کا جائزہ لیتے ہیں تاکہ اندازہ ہو سکے کہ مغرب کا معصوم بچپن بھی کس طرح جنس اور تشدد پسندی کے چنگل میں جکڑا جا چکا ہے۔

جرمنی

حکومتی رپورٹوں کے مطابق جرمنی میں گذشتہ ایک سال کے دوران بچوں پر جنسی حملوں کی تعداد ۱۷ ہزار تک جا پہنچی ہے۔ یہ تعداد صرف ان جرائم کی ہے جن کی رپورٹ تھانوں تک پہنچی وگرنہ سروے کرنے والے ادارے کا کہنا ہے کہ ان حملوں کی تعداد ۲ لاکھ کے لگ بھگ ہے یعنی ہر ۳ منٹ کے بعد کسی نہ کسی بچے پر جنسی حملہ ہو رہا ہوتا ہے۔ یہ وہ بچے ہیں جن کی عمر ۱۵ سال سے کم ہے۔

یہ صورت حال کوئی اچانک رونما نہیں ہو گئی بلکہ مغربی تہذیب کے اہم عناصر --- بے قید

آزادی، خاندانی زندگی کا زوال، اور جنسی جذبات کو بھڑکانے والے فواحش کی کثرت سے اشاعت --- کا ایک لازمی نتیجہ ہے۔ سرکاری سروے رپورٹوں کا کہنا ہے کہ جرمنی میں صرف ایک نسل جوان ہونے کے دوران شادی کا رجحان ۲۵ فی صد کم ہو گیا ہے۔ اس وقت وہاں ایک کروڑ ۲۰ لاکھ افراد تنہا زندگی گزار رہے ہیں، جن میں سے ۴۲ فی صد نے شادی کی ہی نہیں۔ شادی کے بغیر مرد اور عورت کے اکٹھا رہنے کے رجحان میں زبردست اضافہ ہوا ہے۔ ۲ کروڑ ۳۰ لاکھ شادی شدہ جوڑوں کے ساتھ ہی ساتھ ایک کروڑ ۲۰ لاکھ جوڑے ایسے بھی ہیں جو شادی کے بغیر ایک دوسرے کے شریک حیات ہیں۔ ایک سال میں ہونے والی ۴ لاکھ ۴ ہزار شادیوں میں سے ۲۴ فی صد کا انجام طلاق کی صورت میں نکلا ہے اور یہ نسبت سال ۹۲-۹۳ کے مقابلے میں ۱۵٫۹ فی صد زیادہ ہے۔

ایک طرف خاندان کا یہ حال ہے، دوسری طرف بچے ماں باپ کی توجہ سے محروم ہیں۔ بچوں کی ایک تہائی تعداد یتیم خانوں یا حکومتی پرورش گاہوں میں رہ رہی ہے۔ ایک تہائی تعداد ایسی ہے جو شادی نہیں دوستی کے نتیجے میں وجود میں آئی۔ جو خوش نصیب بچے اپنے والدین کی سرپرستی میں زندگی بسر کر رہے ہیں انھیں والدین کا کتنا پیار اور توجہ نصیب ہوتی ہے؟ اس کا اندازہ ستمبر ۹۴ کی ایک سرکاری سروے رپورٹ سے ہوتا ہے جس میں افراد خانہ کے اوقات کار کا جائزہ لیا گیا تھا۔

اس رپورٹ کے مطابق: ایک جرمن بچے کو ۲۴ گھنٹے میں ماں یا باپ کے وقت میں سے اوسطاً صرف آدھا گھنٹہ نصیب ہوتا ہے۔ جس میں کھانے کا وقت بھی شامل ہے۔ جبکہ ایک ماں روزانہ اوسطاً آدھا گھنٹہ اپنے دوستوں سے فون پر گپ شپ کرتی ہے، اور تقریباً ۵ گھنٹے ٹیلیویژن، سینما، تھیٹر یا دوسرے تفریحی مشغلوں میں گزارتی ہے۔

بچے کے بقیہ ساڑھے تیئس گھنٹے کہاں اور کیسے صرف ہوتے ہیں؟ اس کا جواب بچے کی صرف ایک مصروفیت ہی سے جانا جا سکتا ہے۔ وہ مصروفیت ہے بچے کے ٹی وی کے سامنے اوقات۔ پورے سال میں ایک بچہ روزانہ اوسطاً اڑھائی گھنٹے ٹی وی کے سامنے گزارتا ہے۔ اس دوران وہ روزانہ کم از کم ۵۰ مناظر قتل کی وارداتوں کے دیکھتا ہے اور بیلے فیلڈ یونیورسٹی کے ایک سروے کے مطابق ان مناظر کا اثر بچوں میں تشدد پسندی کے بڑھتے ہوئے رجحان کی صورت میں نکلا ہے۔ اس رپورٹ کا کہنا ہے کہ سکول کے بچوں میں تشدد کا رجحان ۱۵ فی صد بڑھا ہے۔ ہومبولڈٹ یونیورسٹی کی ایک سروے رپورٹ کے مطابق جرمنی کے ایک تہائی طلبہ اب مسلح ہو کر تعلیم گاہوں میں آتے ہیں۔ برلن پولیس کے مطابق شہر میں ہونے والے ۴۵ فی صد متشددانہ جرائم ۱۴ سے ۱۸ سال تک کی عمر کے بچے کرتے ہیں، جبکہ ۵ فی صد جرائم ۱۴ سال سے بھی کم عمر کے بچے کرتے ہیں۔

جرمنی میں جرائم کی عمومی شرح بھی پہلے سے بہت بڑھ گئی ہے۔ ۱۹۸۰ء میں ۳۸ لاکھ جرائم ہوئے تھے، جبکہ ۱۹۹۲ء میں ۶۳ لاکھ وارداتیں ہوئیں۔

اوجسبورگ یونیورسٹی کے پروفیسر فیزر نے اپنے دو سالہ سروے کے بعد ایک رپورٹ میں کہا ہے کہ پرائمری سکول کے جرمن بچوں میں سے ۵۵ فی صد بچے ایک ہفتے میں ۳ گھنٹے ٹی وی دیکھنے میں گزارتے ہیں۔ ان میں سے ۲۵ فی صد بچوں نے ایسی ایسی فلمیں دیکھیں جن کا دیکھنا بچوں کے لیے ممنوع تھا اور جو جنس اور تشدد پر مبنی تھیں۔ اس رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ ٹی وی کے یہ مناظر بچوں کی روزمرہ زندگی میں تشدد پسندی کا موجب بنے۔

عالم اسلام کے مغرب پرستوں کے لیے یہ اطلاع بھی بے حد اہم ہے کہ اس اخلاقی بگاڑ کے نتیجے میں اب مغربی باشندے حکومت کے سامنے ہاتھ جوڑ رہے ہیں کہ خدارا ٹی وی پر ان جنسی اور تشدد آمیز فلمی مناظر کا دکھایا جانا بند کیا جائے۔ جرمنی کے ایک بڑے ہفت روزہ "ڈی تسایت" نے ایک مفصل رپورٹ میں یہ انکشاف کیا ہے کہ ٹی وی پر یہ مناظر دکھانے پر پابندی کے مطالبے کے لیے اب تک دس لاکھ سے زاید افراد ایک محضرنامے پر اپنے دستخط کر چکے ہیں۔

جرمنی میں جہاں ایک فرد کی اوسط سالانہ آمدنی ۳۲ ہزار مارک ہے، بچوں کی شرح پیدائش خوفناک حد تک کم ہو چکی ہے۔ ایک سروے کے مطابق ۵۶ فی صد شادی شدہ افراد بچوں کے خواہش مند ہیں لیکن وہ جرمن معاشرے میں بچوں کے ساتھ سلوک دیکھ کر بچے پیدا نہیں کر رہے۔ اس وقت بچوں سے محروم جرمن جوڑوں کی تعداد ۸۶ لاکھ ہے۔ ۱۱ لاکھ جوڑوں کے ایک یا ایک سے زیادہ بچے ہیں، جبکہ ۲۶ لاکھ خواتین ایسی ہیں جو بچے کے باپ کے بغیر ایک ایک بچے کی پرورش کر رہی ہیں۔

اس صورت حال میں جرمن حکومت سالانہ اربوں جرمن مارک اس مد پر صرف کر رہی ہے کہ شادی شدہ جوڑے گھر بار بسائیں اور بچے پیدا کریں۔ لیکن پروفیسر مالوییں کے بقول "اب حکومت پیسے کے ذریعے بچے پیدا کروانے سے تو رہی"۔

مغرب کی خود اپنے لیے پالیسی تو یہ ہے لیکن قاہرہ کانفرنس میں پاکستانی مسلمان خاتون نفیس صادق صاحبہ سے یہ اعلان کروایا ہے کہ "آئندہ پانچ برسوں میں مانع حمل وسائل مہیا کرنے پر ۴ ارب ڈالر صرف کیے جائیں گے"۔

فرانس

جرمنی کی طرح فرانس میں بھی بچوں پر جنسی اور جسمانی تشدد کی شرح بہت خوفناک ہے۔ بچوں پر جسمانی تشدد کے ضمن میں یہ بات خاص طور پر نوٹ کی گئی ہے کہ ان میں سے اکثر جرائم ان بچوں کی

ماؤں کے عاشقوں ' دوستوں یا دوسرے خاوندوں کی طرف سے کیے گئے تھے۔ ان جرائم میں سے ۴۰۰ سے ۶۰۰ تک بچے تشدد کی تاب نہ لا کر جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ ڈیوڈ ہیٹن نامی بچہ کا واقعہ فرانسیسی پریس میں خوب نمایاں ہوا۔ ڈیوڈ پر اس کی ماں اور ماں کے دوسرے شوہر نے مل کر سات برس تک ہر طرح کا ظلم روا رکھا ' اور ان سات سالوں میں سے ایک پورا سال ایسا بھی تھا کہ جس میں اسے دیوار میں بنی الماری میں مقید کر کے رکھا گیا اور وہ پورا سال روشنی کی کوئی کرن تک نہ دیکھ سکا۔

جسمانی تشدد کے علاوہ جنسی تشدد کے واقعات بھی دل دہلا دینے والے ہیں۔ ایک طلاق یافتہ خاتون ڈاکٹر نے تو اپنے ایک سفارت کار دوست کے کہنے پر اپنی چار سالہ بچی کو بھی خواہش حیوانی کی بھینٹ چڑھا دیا ' اور اپنی نظروں کے سامنے۔

پیرس کی عدالت کے ایک ماہر نفسیات رونالڈ سالیتجار کا کہنا ہے کہ اس طرح کے اکثر جرائم کے پیچھے ٹی وی کا ہاتھ ہوتا ہے۔ فرانسیسی رسالے "لو یوان" نے ٹی وی پروگراموں کے ایک ہفتے کے تجزیے کے بعد بتایا کہ ایک ہفتے میں ٹی وی پر ۶۷۰ قتل ' ۱۵ اجرا آبروریزی ' ۲۰ جنسی اور ۲۷ ایذا رسانی کے مناظر دکھائے گئے اور ایک سروے کے مطابق فرانسیسی بچہ سال میں ۱۲ گھنٹے ٹی وی سکرین کے سامنے گزارتا ہے ' جبکہ ۹۰۰ گھنٹے سکول میں۔ یہ سروے رپورٹ فرانسیسی بچوں کے اصل استاد اور مربی کی نشان دہی کے لیے کافی ہے۔

برطانیا

برطانوی اخبار گارڈین کے مطابق برطانوی بچے عموماً ۱۶ سال کی عمر میں شراب نوشی شروع کر دیتے ہیں ' جبکہ ۱۵ برس کی عمر میں برطانوی بچوں کی ایک چوتھائی تعداد منشیات کا استعمال شروع کر دیتی ہے۔ ان منشیات میں سب سے زیادہ استعمال چرس کا ہوتا ہے۔ لڑکوں میں سے ۲۸٫۱ فی صد چرسی ہوتے ہیں جبکہ لڑکیوں میں چرس نوشی کی شرح ۲۱٫۷ فی صد ہے۔

کچھ عرصہ پہلے پورا برطانوی معاشرہ یہ سن کر لرز اٹھا کہ دس دس سال کے دو بچوں نے ایک دو سال کے بچے کو اغوا کیا ' پتھروں سے کچل کر مار ڈالا ' اور پھر قتل کو حادثے کا روپ دینے کے لیے اس کی لاش ٹرین کے آگے پھینک دی۔ تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ قاتلوں کا مقصد صرف اپنی دیکھی ہوئی فلموں کی نقالی کرنا تھا۔ اس سانحے پر برطانوی معاشرہ چیخ اٹھا اور وزیر داخلہ سے مطالبہ کرنے لگا کہ بچوں کو ایسی ویڈیو فلم دینے پر پابندی لگائی جائے۔ سروے رپورٹوں کا کہنا ہے کہ ایک بچہ ۱۶ سال کی عمر میں تقریباً ۵۰ ہزار قتل کی وارداتیں دیکھ چکا ہوتا ہے۔

برطانوی پریس کی سروے رپورٹ کے مطابق برطانیہ میں جرائم کی تعداد ۱۱ لاکھ ۱۴ ہزار تک جا

پہنچی ہے۔اس رپورٹ میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ چوریوں کی اکثر وارداتیں ۲۱ سال سے کم عمر کے بچوں نے کی ہیں۔گھروں میں چوریوں کی وارداتیں ۱۹۷۲ سے ۱۹۹۴ تک ۱۲۷ فی صد بڑھ چکی ہیں جبکہ جبری آبروریزی کے واقعات میں ۱۹۸۹ سے ۱۹۹۴ تک ۳۲ فی صد اضافہ ہوا ہے۔

جولائی ۱۹۸۹ سے لے کر جون ۱۹۹۰ تک برطانوی پولیس کے پاس درج شدہ جرائم میں درج ذیل اضافہ ہوا ہے۔چوری کی بڑی وارداتوں میں ۵۲ فی صد 'عام گھریلو چوریوں میں ۲۲ فی صد 'تشدد کی وارداتوں میں ۶ فی صد اور دہشت گردی کی وارداتوں میں ۱۶ فی صد۔

ان سروے رپورٹوں سے واضح ہوتا ہے کہ برطانوی معاشرہ مکمل اخلاقی بحران کا شکار ہو چکا ہے۔اخلاقی دیوالیہ کا اس سے بڑھ کر ثبوت اور کیا ہو گا کہ بڑے بڑے سیاستدان 'فنکار' تاجر اور معاشرے کے "معزز" افراد ٹی وی کی سکرین پر آکر علی الاعلان اپنے ہم جنس پرست ہونے کا اقرار کرتے اور اس پر فخر کرتے ہیں۔

امریکا

امریکی معاشرے کا مطالعہ کرتے ہوئے درج ذیل اہم پہلو سامنے آتے ہیں۔

مادی تہذیب: ہر امریکی باشندہ مادی ترقی کی دوڑ میں اس بُری طرح مصروف ہے کہ والدین کو اپنی اولاد کی تربیت کا وقت ملتا ہے نہ وہ اس کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔اس لیے بچوں کو تنہا گھر میں چھوڑ دیا جاتا ہے یا پھر نرسری میں داخل کروا دیا جاتا ہے جہاں آیائیں اپنی مرضی اور صلاحیت کے مطابق ان کی پرورش کرتی ہیں۔والدین کی شفقت سے محروم پرورش پانے والے بچے متعدد نفسیاتی اور اخلاقی عوارض کا شکار ہو رہے ہیں جس کے لیے بعض اوقات عدالتوں کو مداخلت کرنا پڑتی ہے۔

سکول کی تعلیم امریکی سکولوں میں بچوں کی مذہبی تعلیم پر پابندی عائد ہے۔اس طرح تینوں آسمانی مذاہب کی اخلاقی تعلیمات پر کلاس روم کے دروازے بند ہو گئے ہیں۔اس صورت حال میں بچے ذہنی خلفشار کا شکار ہو جاتے ہیں۔وہ کسے اپنا آئیڈیل بنائیں؟ کیا ان اساتذہ کو جو خود بھی متعدد اخلاقی برائیوں کا شکار ہیں یا ریڈیو اور ٹی وی پر آنے والے ان بڑے ناموں کو' جو آئے دن اپنے گھناؤنے اخلاقی جرائم کا علی الاعلان اقرار کرتے رہتے ہیں۔

تعلقات مرد و زن: ابتدائی عمر سے ہی بچوں کے ذہن میں یہ بات راسخ کی جاتی ہے کہ جنس مخالف سے اس کا تعلق اور دوستی بے حد ضروری ہے تاکہ عملی زندگی میں اسے ایک بہتر ساتھی کی تلاش میں آسانی رہے۔بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ اگر کوئی بچہ جنس مخالف میں سے اپنا کوئی دوست نہیں بنا پاتا تو اس کے والدین اسے ماہرِ نفسیات کے پاس لے جاتے ہیں کہ اسے شاید کوئی نفسیاتی بیماری

لاحق ہے۔

اس کا عملی نتیجہ یہ نکلا ہے کہ دوستی کی تلاش میں سرگرداں بچے اوائل عمر میں ہی جنسی تجربات سے گزر جاتے ہیں۔ اس گھمبیر صورت حال کے پیش نظر بعض امریکی سکول پانچویں کلاس کے طلبہ میں مانع حمل آلات تقسیم کر رہے ہیں۔ اور تیرہ برس کی ہر دس بچیوں میں سے ۹ بچیاں ایسی ہوتی ہیں جو اپنے جنسی تعلقات کا فخریہ ذکر کرتی دکھائی دیتی ہیں اور جو ایک باقی بچتی ہے وہ بھی صرف اس لیے کہ اسے کوئی مناسب ساتھی نہیں ملا ہوتا۔ نیو جرسی سٹیٹ میں تو نوبت بایں جا رسید کہ ہر پانچ بچوں میں سے چار بچے ولد الزنا ہوتے ہیں۔

ٹی وی کی مادر پدر آزادی: امریکی سروے رپورٹوں کے مطابق تمام تر قوانین کے باوجود ایک امریکی بچہ تیرہ برس کی عمر تک پہنچتے پہنچتے اپنے ذہن میں ایک لاکھ مناظر کسی نہ کسی صورت میں محفوظ کر چکا ہوتا ہے۔ ان میں سے ۸ ہزار مناظر قتل ' خودکشی اور تشدد و جنس پر مشتمل ہوتے ہیں۔

طلاق: قانونی طور پر ریکارڈ شدہ طلاق کے واقعات میں ۱۵ فی صد اضافہ ہو چکا ہے ' جبکہ طلاق کے جن واقعات کا کوئی ریکارڈ نہیں ہوتا۔ ان کا شمار مشکل ہے۔ طلاق شدہ ماں یا باپ کے ساتھ رہنے والے بچے بعض اوقات اپنے معاشرے سے اتنے نالاں ہو جاتے ہیں کہ وہ ہر چیز سے اپنی محرومیوں کا انتقام لینا چاہتے ہیں۔

یہ ہے وہ مغربی معاشرہ اور اس کی تہذیبی اقدار جس کے پجاری اسلام کی اعلیٰ اخلاقی تعلیمات کو چھوڑ کر ' ماڈرن دکھائی دینے کے شوق میں ملک و ملت کا مستقبل داؤ پر لگانا چاہتے ہیں۔ کیا مغرب کے تمام ناسور اعداد و شمار کی صورت میں کھل کر سامنے آنے کے باوجود بھی ہمارے بھائی اسی مغربی ترقی کے سراب کے پیچھے دوڑتے رہیں گے؟

رسائل و مسائل

کیا اللہ کو گناہ کر کے توبہ کرنے والے لوگ مطلوب ہیں؟

ایک حدیث ہے کہ ابو ایوب انصاری ؓ جب دنیا سے رخصت ہونے لگے تو فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا تھا کہ اگر تم سب لوگ ملائکہ کی طرح بے گناہ ہو جاؤ اور تم سے کوئی گناہ سرزد نہ ہو تو اللہ تعالیٰ اور مخلوق پیدا کر دے گا جو گناہ کر کے توبہ کریں گے (صحیح مسلم)۔

اس حدیث کی تشریح کے سلسلے میں ذہن میں ایک کھٹک سی پیدا ہوتی ہے۔ براہ کرم آپ اس حدیث کے بارے میں محدثین کی آرا اور خود اپنی رائے بھی تحریر فرمائیں۔

آپ نے جس حدیث کا حوالہ دیا ہے، وہ صحیح مسلم "کتاب التوبہ باب سقوط الذنوب بالاستغفار و التوبہ" میں دو سندوں کے ساتھ نقل ہوئی ہے۔ ابو ایوب انصاری ؓ کی اس روایت کے بعد اسی مضمون کی ابو ہریرہ ؓ کی ایک روایت بھی صحیح مسلم میں نقل ہوئی ہے۔ تینوں احادیث کا مفہوم ایک ہی ہے۔

یہ حدیث سنداً تو بالکل صحیح حدیث ہے، اس لیے صحیح مسلم ان کتابوں میں شامل ہے جو صحیح احادیث ہی پر مشتمل ہوتی ہیں۔ لیکن اس کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لیے آپ پہلے تین باتوں کو اپنے ذہن میں رکھیں تاکہ الجھن اور کھٹک کا ازالہ ہو جائے۔

۱۔ کسی حدیث اور آیت کی تشریح و تفسیر کے لیے موضوع سے متعلق دوسری احادیث و آیات کو سامنے رکھنا چاہیے۔

۲۔ بعض احادیث و آیات کا اسلوب بیان قانونی ہوتا ہے جس میں محدود و مخصوص الفاظ میں شریعت کے قانون اور ضابطے کی وضاحت مقصود ہوتی ہے، اور بعض احادیث و آیات کا اسلوب خطیبانہ اور واعظانہ ہوتا ہے جس میں حکم بیان کرنا مقصود نہیں ہوتا۔ اس نوع کے واعظانہ، خطیبانہ اور ترغیبی یا ترہیبی کلام میں الفاظ کا لغوی مفہوم مراد نہیں ہوتا بلکہ جذبات کو ابھارنا اور عمل پر آمادہ کرنا مقصود ہوتا ہے۔ اس قسم کے الفاظ میں مبالغہ اور فرضی قسم کی مثالیں بھی بیان ہوتی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ قانون ساز بھی تھے اور واعظ بھی تھے۔ اس لیے آپ کے کلام میں دونوں پہلو جلوہ گر ہوتے ہیں۔ بحث

فہمی کا ذوق سلیم رکھنے والا شخص موقع و محل کی مناسبت سے اور دوسری احادیث کی روشنی میں رسول اللہ ؐ کا منشا معلوم کر سکتا ہے۔

۳- خلافت ارضی کا منصب اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو نہیں بلکہ انسان کو دیا ہے۔ فرشتوں کے اندر گناہ کی سرے سے قوت ہی نہیں ہے۔ اگر ان کو زمین کی خلافت دی جاتی تو اللہ کی قہار، جبار، عفو، تواب اور غفار کی صفات کا ظہور نہیں ہو سکتا تھا۔ انسان کے اندر خیر کی قوت کے ساتھ شر کی قوت بھی رکھی گئی ہے۔ اس کا نفس امارہ بالسوء بھی ہے اور لوامہ یا مطمئنہ بھی ہے۔ انسان کبھی عالم بالا اور ملکیت کی جانب متوجہ ہوتا ہے اور کبھی عالم سفلی اور بہیمیت کی جانب متوجہ ہو جاتا ہے۔ انسان کامل یعنی نبی سے چونکہ اصلاح اور دعوت و ارشاد کا کام لیا جاتا ہے، اس لیے بشر ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ اس کو گناہوں اور برائیوں سے محفوظ و معصوم رکھتا ہے۔ لیکن باقی انسان اپنے اعمال کے اعتبار سے رحمت و مغفرت کا مظہر بھی ہوتے ہیں اور قہر و غضب کا مظہر بھی ہوتے ہیں۔ واللہ علیم حکیم۔

پہلے قاعدے کی روشنی میں جب ہم اس حدیث پر غور کرتے ہیں تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ اصل مقصد گناہوں پر آمادہ کرنا نہیں ہے، بلکہ توبہ و استغفار کی ترغیب دلاتا ہے اور مایوسی کے احساس کا ازالہ کرنا پیش نظر ہے۔ اس لیے کہ متعدد آیات و احادیث میں اللہ و رسول ؐ کی نافرمانی سے اور گناہوں کے ارتکاب سے روکا گیا ہے اور گناہ کا ارتکاب کرنے والوں کو عذاب کی وعید سنائی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ انسانی و بشری کمزوری کی بنا پر گناہوں کا صدور تو ہوتا رہے گا۔ اگر ان کو توبہ و استغفار کی فضیلت و اہمیت نہ بتائی جائے تو وہ مایوسی کا شکار ہو کر مزید گناہ کریں گے۔ لاتقنطوا من رحمة الله ، ان الله یغفر الذنوب جمیعاً کا بھی یہی مفہوم ہے۔ اگرچہ اللہ کی رحمت و مغفرت کے بھروسے پر گناہوں کا ارتکاب کرنا حماقت و بغاوت ہے، لیکن گناہ سرزد ہو جانے کے بعد اللہ کی اس رحمت و مغفرت سے مایوس ہو جانا بھی حماقت و جہالت ہی کی ایک قسم ہے۔

یہی بات زیر بحث حدیث میں بیان ہوئی ہے کہ مغفرت و رحمت اللہ کی صفت ہے اس کا ظہور ہو کر رہے گا۔ اگر بالفرض تمہارے گناہ سرے سے موجود ہی نہ ہوں، تو اللہ تعالیٰ کوئی دوسری مخلوق پیدا کر دے گا جو گناہ کرنے کے بعد مایوس نہیں ہوگی بلکہ توبہ و استغفار کرے گی۔ لہٰذا تم سے بھی اگر گناہ صادر ہو جائے تو مایوس ہونے کی بجائے توبہ و استغفار کے حکم پر عمل کرو۔ نہ صرف یہ کہ توبہ و استغفار سے تمہارے گناہ معاف ہو جائیں گے، بلکہ یبدل الله سیئاتهم حسنات سے معلوم ہوتا ہے کہ مزید حسنات و درجات سے بھی نوازے جاؤ گے۔

دوسرے قاعدے کی روشنی میں دیکھا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ زیر بحث حدیث میں اسلوب کلام خطیبانہ اور واعظانہ ہے۔ مقصد یہ نہیں ہے کہ تم گناہ کرو تاکہ اللہ تعالیٰ مغفرت کرے، بلکہ مقصد

یہ ہے کہ چونکہ تم سے گناہ صادر ہوتے ہیں اس لیے توبہ و استغفار کرو تاکہ اللہ تعالیٰ معاف کر دے۔ گناہ کے صدور کی خبر دے کر توبہ کا حکم دیا گیا ہے ، گناہ کا حکم دے کر توبہ کا حکم نہیں دیا گیا۔

تیسرے قاعدے کی روشنی میں دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی خلافت معصوموں کے لیے نہیں ہے بلکہ انسانوں کے لیے ہے ، جو رحمت کا مظہر بھی ہیں اور غضب کا مظہر بھی ہیں۔ حدیث میں یہ نہیں کہا گیا کہ میں دوسری مخلوق پیدا کرتا ہوں ، بلکہ یوں کہا گیا ہے کہ اگر تم گناہ نہ کرتے تو میں دوسری مخلوق پیدا کر دیتا ، لیکن چونکہ تم گناہ کرتے ہو تو صفت غفاریت کے ظہور کے لیے دوسری مخلوق پیدا کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔

حاصل بحث یہ ہے کہ انسان گناہ کرتے رہیں گے ، لیکن اللہ بھی مغفرت فرماتے رہیں گے ، بشرطیکہ انسان توبہ و استغفار کرتا رہے۔ اس لیے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ (گوہر رحمن)

پرانے قبرستان پر مسجد کی تعمیر

ہمارے گاؤں کا ایک قبرستان ہے ، جس میں اکثر قبروں کے آثار تک ختم ہو چکے ہیں۔ اس پر محکمہ تعلیم نے پرائمری سکول تعمیر کیا۔ اب قبرستان سے ملحقہ محلے والوں نے ایک دارالعلوم اور مسجد کی تعمیر شروع کر دی ہے۔ واضح فرمائیں کہ اس قبرستان پر پہلے سکول کی ، اور اب دارالعلوم اور مسجد کی تعمیر جائز ہے یا نہیں؟

قبرستان کی زمین اگر مشترکہ ملکیت ہے ، اور مالکان نے قبرستان کے لیے ابتدا میں وقف نہیں کی تھی بلکہ ویسے ہی اس میں مردے دفنانے شروع کر دیے تھے تو اب ، جبکہ قبرستان بہت پرانا ہو چکا ہے اور قبروں کے نشانات باقی نہیں رہے ، اس جگہ مسجد ، مدرسہ یا سکول کے لیے عمارت بنانا جائز ہے ، بشرطیکہ تمام مالکان راضی ہوں۔ شرعاً اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ "اور اگر میت کی لاش پرانی ہو کر مٹی سے مل جائے تو اس کی قبر میں دوسرے کو دفن کرنا یا اس میں فصل اگانا یا اس پر کوئی عمارت بنانا جائز ہے" (عالمگیری ، ص ۱۶۷ ، شامی ، ص ۸۳۵)۔

لیکن اگر قبرستان مردے دفنانے کے لیے ابتدا ہی سے وقف چلا آ رہا ہے --- اور بظاہر آپ کی بستی کے قبرستان کی حالت ایسی ہی معلوم ہوتی ہے --- تو اس صورت میں ، اگر گاؤں کے لوگوں کو مردے دفنانے کے لیے اس کی ضرورت باقی ہے اور وہ اسے قبروں ہی کے لیے استعمال کرتے ہیں ، اس پر سکول ، مدرسہ یا مسجد بنانا جائز نہیں ہے۔ اس لیے کہ واقفین (وقف کرنے والوں) نے اسے مردے دفنانے ہی کے لیے وقف کیا تھا۔ جب تک یہ ضرورت باقی ہے اس وقت تک اس جگہ کو دوسرے مقاصد کے لیے استعمال کرنا جائز نہیں ہے ، اگرچہ دوسرے مقاصد نیک بھی ہوں۔

فتاویٰ عالمگیری کے کتاب الوقف میں لکھا ہے: "شمس الائمہ اوزجندی" سے سوال کیا گیا تھا کہ قبرستان جب پرانا ہو جائے' اور اس میں مردوں کے آثار باقی نہ رہیں' نہ ہڈی اور نہ کوئی اور چیز' تو اس صورت حال میں اس قبرستان میں غلہ اگانا اور اس سے آمدن حاصل کرنا جائز ہے؟ فرمایا' نہیں۔ اسے قبرستان ہی کا حکم حاصل ہے۔ محیط میں بھی اسی طرح کہا گیا ہے۔ محشی نے کہا ہے کہ اوزجندی کا یہ قول زیلعی کے اس قول کے منافی نہیں ہے جو اس نے تبیین کے باب الجنائز میں کہا ہے کہ جب میت کی لاش پرانی ہو کر مٹی میں مل جائے تو قبرستان میں غلہ اگانا اور اس پر عمارت بنانا جائز ہے اس لیے کہ یہاں پر مانع قبرستان کی زمین کا وقف ہونا ہے تو اس وجہ سے مردے دفنانے کے علاوہ دوسرے مقاصد کے لیے اس کا استعمال کرنا جائز نہیں ہے"۔

ابن عابدین شامی "نے بھی کہا ہے کہ وقف کی شرائط کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے' جب کہ وہ شریعت کے خلاف نہ ہوں (شامی' ج ۳' ص ۴۹۹)۔

لیکن' اگر بستی کے لوگوں کو قبرستان کی اب ضرورت نہ ہو اور انھوں نے اس میں اپنے مردے دفنانا ترک کر دیا ہو' تو ایسی حالت میں اس کو ذاتی استعمال میں لانا اور اس پر مالکانہ قبضہ کرنا تو جائز نہیں ہے' لیکن اس پر مسجد بنانا جائز ہے۔ اس لیے کہ مسجد بھی وقف ہے اور قبرستان بھی وقف ہے' اور ایک وقف کو دوسرے وقف میں تبدیل کیا جاسکتا ہے جبکہ پہلے وقف کی ضرورت باقی نہ رہے۔

علامہ بدر الدین عینی حنفی لکھتے ہیں: "اگر تو پوچھے کہ آیا مسلمانوں کی قبروں پر مسجد بنانا جائز ہے' تو میں کہوں گا کہ ابن القاسم "نے کہا ہے کہ اگر مسلمانوں کا کوئی قبرستان پرانا ہو جائے اور اس پر لوگوں نے مسجد بنا لی ہو' تو میں اس میں کوئی مضایقہ نہیں سمجھتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کا قبرستان مردے دفنانے کے لیے وقف ہے اور کسی کو اس پر مالکانہ قبضہ جمانا جائز نہیں ہے۔ لیکن جب وہ پرانا ہو گیا ہو اور لوگوں کو اس میں اپنے مردے دفنانے کی حاجت باقی نہ رہی ہو' تو اس وقف کو مسجد میں منتقل کرنا جائز ہے۔ اس لیے کہ مسجد بھی مسلمانوں کا وقف ہوتی ہے جس پر مالکانہ قبضہ کسی کے لیے جائز نہیں ہے (گوہر رحمن)۔

بنک کا سود

۱۔ مجھے کسی عالم نے بتلایا کہ بنک کے سود کی رقم استعمال میں نہیں لانی چاہیے' بلکہ کسی ضرورت مند کو دے دینی چاہیے۔ نیکی یا اللہ واسطے کی نیت سے نہیں' بلکہ غلط رقم کے استعمال سے بچنے کی غرض سے۔ میں اس پر عمل کر رہا ہوں کیوں کہ بنک کے پاس چھوڑنا بھی ٹھیک نہیں۔ کیا یہ طریق کار ٹھیک ہے؟

۲۔ ہمارے محلے میں مسجد کی رقومات ایک صاحب کے پاس رہتی ہیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ بنک میں

رکھی جائیں۔ دوسرے لوگ سود کی وجہ سے اسے قابل اعتراض قرار دیتے ہیں۔ ہمارے لیے صحیح راستہ کیا ہے؟

۱۔ بنک کا ادا کردہ منافع سودی ہوتا ہے۔ اس کا مصرف مضطر فقرا اور مساکین ہوتے ہیں۔ جس عالم دین نے آپ کو یہ مسئلہ بتلایا ہے کہ اسے اپنے استعمال میں نہ لائیں اور بنک کے پاس بھی نہ رہنے دیں' انھوں نے صحیح مسئلہ بتلایا ہے۔ یہ بات حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ جس مال حرام کو اس کے اصل مالک کو واپس نہ کیا جا سکتا ہو اسے حالت اضطراری میں مبتلا فقرا اور مساکین میں صرف کیا جائے کہ وہی اس کا مصرف ہیں۔ اکثر علما کا یہی مسلک ہے۔

۲۔ مسجد فنڈ آپ بنک میں رکھ سکتے ہیں۔ کرنٹ اکاؤنٹ میں سود نہیں لگتا لہٰذا آپ کرنٹ اکاؤنٹ میں رقم رکھ دیں۔ اس میں سے زکوٰۃ بھی نہیں کاٹی جاتی۔ بنک میں بطور امانت رکھی ہوئی رقم پر اگر سود لگ جائے تو بنک سے لے کر مفلوک الحال مسلمانوں کو دے دیا جائے۔ بوسنیا اور کشمیر کے مجاہدین اور مہاجرین پر خصوصی توجہ دی جائے۔ (عبدالمالک)

درود میں آل کا لفظ

رسول اللہ ؐ پر درود پڑھنے میں آل کو شامل نہ کرنے پر کچھ لوگ معترض ہوتے ہیں۔ صحیح صورت کیا ہے؟

قرآن پاک میں اہل ایمان کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوٰۃ و سلام بھیجنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس حکم میں آل کو آپ ؐ کے ساتھ شامل نہیں کیا گیا۔ مثلاً اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا۔ قرآن پاک کی اس آیت میں آل کا ذکر نہیں ہے۔ اسی طرح اکثر احادیث میں بھی صرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوۃ و سلام بھیجنے کا حکم ہے۔ آپ ؐ نے فرمایا: "رغم انف رجل ذکرت عندہ فلم یصل علی" یعنی ذلیل ہو وہ آدمی جس کے سامنے میرا ذکر آئے اور وہ مجھ پر درود نہ بھیجے (ترمذی شریف)۔

اسی طرح آپ ؐ کا ارشاد ہے: "البخیل من ذکرت عندہ فلم یصل علی" جس کے سامنے میرا ذکر آئے اور وہ مجھ پر درود نہ بھیجے وہی در حقیقت بخیل ہے (ترمذی شریف)۔

بعض احادیث میں آپ کے بالتبع آل کو بھی صلوۃ و سلام میں شریک کرنے کی ترغیب آئی ہے۔ قرآن پاک اور احادیث کے مجموعے پر نظر رکھتے ہوئے علما نے جو فیصلے دیے ہیں ان کی رو سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر مبارک آنے پر آپ پر صلوٰۃ و سلام بھیجنا تو ضروری ہے اور آل کو آپ کے بالتبع اس میں شریک کرنا جائز اور مستحب ہے' ضروری نہیں ہے۔ اس لیے صلی اللہ علیہ وسلم اور صلی اللہ

علیہ و آلہ وسلم دونوں طرح پڑھنا اور لکھنا جائز ہے (عبد المالک)۔

مختلف مسلک کے امام کے پیچھے نماز

ہمارے ہاں دو مساجد ہیں: ایک بریلوی حضرات کی ' اور دوسری دیوبندی حضرات کی ہے۔ ہمارے مولوی صاحب شرک و بدعت اور بریلوی حضرات کے کٹر مخالف ہیں۔ میں جماعتی تربیت کے زیر اثر اپنے ہم مسلک لوگوں کے برخلاف ' بریلوی امام کے پیچھے عام نماز اور نماز جنازہ پڑھ لیتا ہوں۔ میرا یہ عمل میرے ہم مسلک ساتھیوں کو برا لگتا ہے۔ کل نماز جمعہ کے خطبہ میں ہمارے مولوی صاحب نے صاف صاف کہہ دیا کہ بریلوی مشرک ہیں اور کسی طور پر بھی ان کے پیچھے نماز نہیں ہوتی بلکہ مقتدی پر الٹا گناہ ہوتا ہے۔ ہمارے مولوی صاحب جانتے ہیں کہ میں جماعت اسلامی کا آدمی ہوں۔ وہ قبل ازیں دبے الفاظ میں مجھ سے بریلوی حضرات سے مکمل اجتناب کا کہتے رہے ہیں۔ اور میں ان سے یہ عرض کرتا ہوں کہ یہ مسلمان ہیں۔ اگر ان کے کچھ عقاید خراب ہیں تو نماز پڑھ لینے میں کوئی مضایقہ نہیں۔ نماز ان کے پیچھے ہو جاتی ہے۔ مگر وہ فرماتے ہیں کہ یہ مشرک ہیں ' ان سے تعلق داری بھی ناجائز اور ممنوع ہے۔ انھوں نے مولانا رشید احمد گنگوہی کا وہ فتویٰ بھی سنایا ہے کہ بریلوی حضرات کا مسلک مشرکانہ ہے لہذا ان کے پیچھے نماز پڑھنا حرام ہے۔ اب ان کے فتویٰ نما انتباہ کے پیش نظر آپ سے رجوع کر رہا ہوں کہ اندریں حالات مجھے کیا کرنا چاہیے؟

گرامی نامہ پڑھا۔ خوشی ہوئی کہ آپ جمہور امت کے فیصلہ پر عمل پیرا ہیں۔ پاکستان اور ہندوستان کے محققین جمہور علمائے اہل سنت (دیوبندی ' اہل حدیث اور بریلوی) ایک دوسرے کے پیچھے نمازیں پڑھنے کے قائل ہیں۔ یہی مسلک مفتیٰ بہ ہے۔ جماعت اسلامی پاکستان اسی راہ اعتدال پر قائم ہے اور اسی کی داعی ہے۔ آپ اسی موقف پر قائم رہیے۔ عامتہ المسلمین اسی نظریے کو درست سمجھتے ہیں۔ بریلوی علما توحید و سنت کی جو تشریح کرتے ہیں ' ان میں سے بعض ہماری رائے میں بھی سلف صالحین کی تعبیر و تشریح سے مطابقت نہیں رکھتیں ' لیکن اس کی وجہ سے ان کی تکفیر نہیں کی گئی۔ بلاوجہ غصے میں آکر ایک محدود دائرہ میں بند ہو کر فتویٰ بازی کا کچھ بھی حاصل نہیں ہے۔ مثبت انداز میں توحید و سنت کی اشاعت کیجیے۔ بریلوی علما کی بعض تشریح سے علمی اختلاف کے باوجود ان پر طعن و تشنیع ' الزام تراشی ' تحقیر و تذلیل کی اجازت نہیں دی جا سکتی ' کہ تمام مکاتب فکر کے حق پسند علما کا یہی نظریہ ہے۔ آپ فریقین سے حسب سابق دوستانہ روابط رکھیں اور انھیں ایک دوسرے کے قریب کرنے کی کوشش کرتے رہیں۔ اصلاح ذات البین بہت بڑی نیکی ہے ' بلکہ اس وقت نیکیوں میں سرفہرست ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائیں (عبد المالک)۔

کتاب نما

سیرت حافظ ابنِ حزم اندلسی : ڈاکٹر عبدالحلیم عویس ' مترجم: محمد رئیس ندوی - ناشر: جامعہ سلفیہ ' بنارس - صفحات: ۲۸۸ - قیمت: درج نہیں -

حافظ ابن حزم کا شمار ' مسلم اندلس کے اکابر میں ہوتا ہے - وہ ایک شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ فقیہ ' مورخ اور عمرانی مفکر بھی تھے - ایک روایت کے مطابق ان کے دادا ' موسیٰ بن نصیر کے ساتھ اندلس آئے تھے - ان کا تعلق ایک معزز اور خوش حال گھرانے سے تھا ' مگر والد کے انتقال اور قرطبہ سے ہجرت کی وجہ سے ابنِ حزم کو تحصیلِ علم کے لیے سازگار ماحول میسر نہیں آیا - بایں ہمہ اپنی ذہانت کے بل بوتے پر وہ وزارت کے منصب تک پہنچے لیکن پھر سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر "تختِ علم پر جلوہ افروز ہونے کی کوشش میں لگ گئے" - زیرِ نظر کتاب ابن حزم کی سوانح ' شخصیت اور علمی خدمات پر ماہر اندلسیات ڈاکٹر عبدالحلیم عویس کی عربی تصنیف ابن حزم الاندلسی وجودہ فی البحث التاریخی و الحضاری کا اردو ترجمہ ہے -

ابن حزم (۹۹۴-۱۰۶۴ء) کی زندگی کا بیشتر حصہ درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں گزرا - ان کے ۳۵ جزوی اور کُلّی رسائل و کتب دستیاب ہیں اور معدوم رسائل کی تعداد ۸۹ ہے - وہ علم الانساب کے ماہر تھے - تاریخ سے بھی انھیں خصوصی دلچسپی تھی ' بلکہ ان کے نزدیک علمِ حدیث کے بعد تاریخ ' جملہ علوم پر فوقیت رکھتی ہے - ایک تو یہ سبق آموزی کا ذریعہ ہے دوسرے اس کی تعلیمی قدر و افادیت ' دوسرے علوم و فنون سے کہیں زیادہ ہے - مصنف کے نزدیک ابن حزم کی ایک حیثیت مجتہد کی بھی ہے ' جنھوں نے دو صدیوں سے بند دروازۂ اجتہاد کو کھول دیا - بعض امور میں تو ان کی رائے بہت متوازن ہے ' جیسے ان کے نزدیک خلفائے راشدین کی افضلیت ان کی خلافت کی ترتیب کے مطابق ہے مگر تقلید کو وہ بدعت اور حرام قرار دیتے تھے اور اس معاملے میں وہ اتنے متشدد تھے کہ امام ابو حنیفہ ؒ اور امام مالک ؒ کے خلاف ان کی "سخت بیانی اور تلخ کلامی" کا ' ڈاکٹر عویس نے بھی اعتراف کیا ہے - (ص ۱۶۷) اسی طرح یہ کہ ان

کے ہاں اہل اندلس کے لیے جانب داری، طرف داری اور عصبیت پائی جاتی تھی (ص ۱۹۹)۔
دلچسپ بات یہ ہے کہ تقریباً ربع صدی قبل نصرانی سپین نے اس "عظیم قرطبی" کی علمی و فکری حیثیت کے اعتراف میں ایک کانفرنس منعقد کی۔ "عشرہ ابن حزم" منایا، جس کے صدر اس وقت کے صدرِ مملکت جنرل فرانکو تھے۔ اس موقع پر ابن حزم کا مجسمہ بھی تیار کر کے قرطبہ شہر میں نصب کیا گیا۔

ڈاکٹر عویس نے 'زمانہ مابعد میں ابن حزم کی فکری و علمی کاوشوں سے متاثر ہونے والوں کی ایک طویل فہرست دی ہے' جن میں ابن خلدون جیسے نامور مورخ و مفکر بھی شامل ہیں۔ خود ابن خلدون نے ابن حزم سے تاثر و استفادے کا اعتراف کیا ہے۔

بلاشبہ مصنف نے ابن حزم سے متعلق ماخذ کی ایک طویل فہرست کھنگال کر لوازمہ جمع و مرتب کرنے میں بڑی محنت و کاوش سے کام لیا ہے اور اس طرح ایک ایسی کتاب تیار کی ہے' جو ہمارے علمی اور فکری سرمائے' بلکہ اردو زبان کے سوانحی ذخیرے میں بھی ایک عمدہ اضافہ ہے۔ (رفیع الدین ہاشمی)

اسلامی تحریک ' درپیش چیلنج: پروفیسر خورشید احمد۔ ناشر: انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز' بلاک ۱۹' مرکز ایف سیون' اسلام آباد۔ صفحات: ۱۰۰۔ قیمت: ۳۰ روپے۔

فکر و نظر کی غلامی' سیاسی محکومی اور معاشی گداگری کے سبب عالم اسلام ایک شدید بحرانی دور سے گزر رہا ہے' صورت یہ ہے کہ قلعے کے پھاٹک دشمن نے باہر سے نہیں توڑے' بلکہ یہ اندر ہی سے کھولے گئے ہیں۔ مسلمانوں میں نام نہاد' روشن خیال اور غیر جانبدار بندگانِ مفاد "برائے فروخت" کی تختی لگائے نظر آتے ہیں۔ اس پر مستزاد قرآن و سنت سے دوری اور فقہی تنگ نظری۔ مختصر یہ کہ اندرونی شکست و ریخت کے ساتھ ساتھ امتِ مسلمہ کو مذہبی اور سیاسی سطح پر بھی بیرونی حملے کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

زیر تبصرہ کتاب میں اس کشمکش سے دوچار' عالم اسلام کے فکری و عملی اور داخلی و خارجی معاملات پر نظر ڈالی گئی ہے اور اس بحران و کشمکش کو چیلنج سمجھ کر قبول کرنے والی اسلامی تحریکوں کے نقطۂ نظر کو بڑی خوبی سے بیان کیا گیا ہے۔ یہ کتاب تین حصوں پر مشتمل ہے:

پہلا حصہ' پروفیسر صاحب کے اس فاضلانہ انگریزی مقالے کا اردو ترجمہ ہے' جس میں مصنف نے اختصار مگر جامعیت کے ساتھ اس آشوبِ عصر کی نشان دہی کی ہے' جو امریکی نیو ورلڈ آرڈر کے

سیاسی اور تہذیبی حملے کی صورت میں عالم اسلام پر مسلط کیا جا رہا ہے۔

آگے چل کر انھوں نے "بنیاد پرستی" کی الزامی غوغا آرائی کا تاریخی پس منظر بیان کرتے ہوئے بتایا ہے کہ "بنیاد پرستی" عیسائی مذہب کا مظہر ہے جس کا اسلامی فکر و عمل میں کوئی مقام نہیں" (ص ۱۵)۔ "چنانچہ اس واضح مسیحی اصطلاح کو مسلمانوں پر چسپاں کرنا نہ صرف غلط بلکہ بدنیتی پر مبنی ہے۔ مسلم احیا اور اس کی رفتار کو "بنیاد پرستی" کہہ دینے سے روکا نہیں جا سکتا..... مغرب کو مسلمانوں سے کوئی خطرہ نہیں بلکہ اس بات کا دُور دُور تک کوئی امکان نہیں ہے کہ مسلمان مسلح ہو کر مغرب پر دھاوا بول دیں۔ مسلمان محض اپنے معاملات درست کرنے کی کوشش کر رہے ہیں مگر مسلم عوام کسی ملک کی بالادستی تسلیم نہیں کرتے (ص ۱۹)۔

کتاب کا دوسرا حصہ "اسلامی احیا، بنیاد پرستی اور اسلامی تحریک" کے عنوان سے ایک طویل انٹرویو پر مشتمل ہے، جسے پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے جیسے ایک شفیق استاد ایک گہرے دلی جذبے، مضبوط استدلال اور علمی وقار کے ساتھ مسائل کی تشریح کر رہا ہے اور اس کے پیش نظر مغالطہ انگیزی کے کانٹوں کو چننا اور حقائق و معارف کی شبنم فشانی کرنا ہے بلکہ سیکھنے اور سمجھنے کے لیے اس کے اپنے دل و دماغ کے دریچے بھی کھلے ہیں۔ یہی اسلامی علمی روایت بھی ہے۔

اس دوسرے حصے میں: بنیاد پرستی، مسلم سوسائٹی کا انحطاط، ایران اور اسلامی انقلاب، تحریک پاکستان اور پاکستان کا نظریاتی بحران، جنگ خلیج [۹۱-۱۹۹۰]، سود کا چیلنج، پرائیویٹائزیشن، علامہ اقبال اور قائداعظم کا تصورِ پاکستان، اقبال کا تصورِ اجتہاد، عورت کی سربراہی، بھارت میں ہندو انتہا پسندی کا احیا وغیرہ موضوعات پر اسلام اور اسلامی تحریکوں کے حوالے سے دلچسپ اور بھرپور مکالمہ ہے۔ اس میں راست غور و فکر کی قوس قزح اپنے روشن رنگوں کے ساتھ ملتی ہے۔

تیسرے حصے (اسلامی تحریک کی قوت) میں مصنف نے ڈاکٹر ممتاز احمد کے سوالات کا جواب دیتے ہوئے واضح کیا ہے کہ اسلامی تحریکات کی اصل قوت اس کے کارکنوں کی سیرت اور ان کا کردار ہے۔ پروفیسر صاحب نے اس قوت کے تقاضوں اور ان کے حصول کے ذرائع کی نشان دہی بھی کی ہے۔

ایک یا دو نشستوں میں بہ آسانی پڑھی جانے والی یہ کتاب 'اسلام اور اسلامی تحریکات کے دفاع پر نہایت عمدہ پیش کش ہے، جسے اسلامی فکر و نظر کے حامل افراد اور مسلم قوم پرستوں کو تو ضرور ہی پڑھنا چاہیے۔ مغرب کے سیاسی و مذہبی نظریہ سازوں اور ان کے مشرقی مریدوں کو بھی اس سے دانش و برہان کے موتی ملیں گے، بشرطیکہ وہ اپنی روایتی "ملائیت" کے حصار سے باہر نکل کر اسے پڑھیں۔ کتاب کے انگریزی اور عربی ترجمے کی ضرورت ہے۔ (سلیم منصور خالد)

شعورِ حیات : محمد یوسف اصلاحی۔ ناشر: البدر پبلی کیشنز ' اردو بازار لاہور۔ صفحات: حصہ اول ۲۰۸' حصہ دوم ۲۲۴۔ قیمت: حصہ اول ۷۲ روپے' حصہ دوم ۹۰ روپے۔

مولانا محمد یوسف اصلاحی کی تصانیف ان کے گہرے دینی شعور' جذبہ ایمانی اور موثر داعیانہ اسلوب کی شاہد ہیں۔ زیر نظر کتاب ان کے تحریر کردہ (ماہنامہ "ذکریٰ" کے) اداریوں کا مجموعہ ہے' کتاب کے حصہ اول میں ۲۸ اور حصہ دوم میں ۳۲ اداریے شامل ہیں۔ ان سب اداریوں میں ایک ہی مشترک مقصد کارفرما ہے' اور وہ ہے افرادِ امت میں اسلامی شعور کی بیداری اور اسلامی زندگی کے محاسن کی تصریح و توضیح۔ کوئی شک نہیں کہ یہ تحریریں اس مقصد کے حوالے سے نہایت موثر اور نتیجہ خیز ہیں۔

قرآن و سنت کا اصل خطاب فرد سے ہے اور اسی کی صلاح و فلاح اس کا بنیادی موضوع ہے۔ ہمہ گیر اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لیے افراد کی اصلاح و تربیت بہت ضروری ہے اور اس کے لیے دلوں میں رضائے الٰہی اور آخرت کی کامیابی کی اہمیت کا شعور پیدا کرنا لازمی ہے۔ اسلامی فکر اور جذبہ ایمانی کی بنیاد پر ہی معیاری اسلامی زندگی کی عمارت تعمیر ہوتی ہے۔ "شعورِ حیات" میں مختلف اسالیب اور دلائل سے یہی بنیاد استوار کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ مولانا محمد یوسف اصلاحی کا قلم محض ایک بلند پایہ ادیب ہی کا قلم نہیں' ایک داعی اور مربی کا قلم بھی ہے' اس لیے ان کی تحریر میں خلوص اور دردمندی کی وجہ سے گہری تاثیر بھی پائی جاتی ہے۔ قدرت نے انھیں حکمتِ تبلیغ سے بہرۂ وافر عطا کیا ہے اور وہ سادہ مگر دلچسپ اور موثر انداز سے بات کہنے کی قابلِ رشک صلاحیت سے مالا مال ہیں اور حسبِ موقع جذباتی اپیل' عقلی استدلال' آیات و احادیث اور واقعات و اشعار سے مدد لے کر اپنے مدعا کی وضاحت کرتے ہیں۔

کتاب میں عام طور پر آیات و احادیث کے حوالے دیے گئے ہیں اور اعراب کا اہتمام بھی ہے لیکن متعدد مقامات پر اس کا خیال نہیں رکھا گیا۔ اسی طرح بعض مقامات پر آیات و احادیث کا متن نہیں دیا گیا صرف اردو ترجمے پر اکتفا کیا گیا ہے۔ اگر اس کمی کو دور کر لیا جاتا تو قارئین کو یقیناً زیادہ فائدہ پہنچتا۔ امید ہے کہ اس سلسلے کے آیندہ مجموعوں میں ان امور کو ملحوظ رکھا جائے گا۔ بہرحال کتاب کے دلچسپ' مفید اور موثر ہونے میں کوئی کلام نہیں۔ (ڈاکٹر رحیم بخش شاہین)

حقیقت ذکر اللہ جمیل : خواجہ غفور احمد۔ ناشر: ۱۸۹ گلشن بلاک' علامہ اقبال ٹاؤن' لاہور۔

صفحات: ۸۴- ہدیہ فی سبیل اللہ۔

خالق ارض و سما کا ذکرِ جمیل' مخلوق کی فطرت میں پیوست ہے۔ شجرو حجر اور پرند و چرند بھی رب ذوالجلال کے ذکر کے لیے اپنے آپ کو بے اختیار آمادہ پاتے ہیں۔ البتہ حضرت انسان اس معاملے میں بسااوقات کوتاہی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہ کتاب ذکرِ ربانی کے بھولے سبق کی یاد دہانی کراتی ہے۔

خواجہ غفور احمد نے اس قیمتی کتاب میں عشقِ حقیقی سے سرشار ہو کر' قرآن و حدیث کی بنیاد پر ذکر الٰہی کی اہمیت اور فوائد پر بڑے متوازن انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ اگرچہ اذکارِ مسنونہ کے موضوع پر اردو میں چھوٹے بڑے متعدد مجموعے موجود ہیں اور بظاہر اس سلسلے میں مزید کسی کام کی گنجائش کم ہی دکھائی دیتی ہے مگر مولف نے اپنے تجربات کی روشنی میں عمدگی سے موضوع کا احاطہ کیا ہے۔ انھوں نے بجا کہا ہے کہ ذکر کے دو بڑے فائدے ہیں' ایک تو بندے کا اپنے خالق سے رابطہ' دوسرے شیطانی وسوسوں سے بچاؤ۔ آخر میں ان کی یہ تنبیہہ بھی برمحل ہے کہ: "ذکر الٰہی کثرت سے اور اٹھتے' بیٹھتے' چلتے' پھرتے' لیٹتے یعنی ہر حال میں کرنا چاہیے' مگر راہبانہ زندگی گزارنے سے اجتناب ضروری ہے"۔ مولف نے ذکر کے ساتھ جہادِ زندگانی میں عملی شرکت کی طرف بھی توجہ دلائی ہے۔

تحقیق' تطبیق اور تخلیق سے آمیخت' اس مجموعے کو آیاتِ ربانی اور احادیثِ پاکیزہ کے نگوں نے دل نشین بنا دیا ہے۔ (س-م-خ)

دینی صحافت (ماہنامہ) مدیر: سجاول خان رانجھا۔ ناشر: انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز' بلاک ۱۹' مرکز ایف سیون' اسلام آباد۔ صفحات: ۵۲- قیمت فی شمارہ: ۱۰ روپے بیرون ملک۔ سالانہ ۱۰۰ روپے بیرون ملک ۱۵ ڈالر۔

پاکستان میں ذرائع ابلاغ کی پس ماندگی کا ایک افسوس ناک پہلو یہ بھی ہے کہ مختلف علوم و فنون اور شعبوں سے متعلق شائع ہونے والے مواد و لوازمے (کتابوں' رسالوں اور متفرقات) کا جائزہ دینے والے ادارے بہت ہی کم ہیں' برائے نام۔ اس کوتاہی کے نتیجے میں اندازہ نہیں کیا جا سکتا کہ کس شعبے میں کیا اور کس سمت میں پیش رفت ہو رہی ہے اور کیا رجحانات و میلانات پنپ رہے ہیں۔ چنانچہ حقیقی صورتِ حال سے بے خبری یا ادھوری اور ناقص اطلاعات کے نتیجے میں' ہمارے سرکاری یا غیر سرکاری ادارے جو پالیسیاں بناتے ہیں' ان سے خاطر خواہ نتائج بر آمد نہیں ہوتے۔ اس پس منظر میں زیرِ تبصرہ مجلہ ماہ بہ ماہ "مذہبی طبقے کے فکری رجحانات کا جائزہ" پیش کر کے' گویا اس شعبے میں "فرض کفایہ" ادا کر رہا ہے۔

انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز نے کئی برس پہلے ' دینی رسالوں کے مضامین کے خلاصوں پر مبنی ماہانہ رپورٹ تیار کرنا شروع کی تھی 'جس نے اب باقاعدہ ایک معیاری ماہنامے کی صورت اختیار کر لی ہے۔ اس میں ہر ماہ 'مختلف مکاتبِ فکر سے متعلق اردو ماہناموں اور ہفت روزوں کے اداریوں اور اہم مضامین کی تلخیص دی جاتی ہے اور آخر میں جملہ رسائل و جرائد کا موضوع وار اشاریہ بھی شامل ہوتا ہے۔ اس وقت بریلوی ' دیوبندی ' اہل حدیث اور شیعہ مکاتبِ فکر اور متفرق نقطہ ہائے نظر کے حامل کل ۵۷ جرائد ' اس جائزے میں شامل ہوتے ہیں۔ ابتدا میں زیر جائزہ ماہ کے اہم موضوعات کا ذکر کیا جاتا ہے 'جس سے اس ماہ کے رجحانات کا کچھ اندازہ ہو جاتا ہے۔

"دینی صحافت" ایک بے لاگ اور معلومات افزا تجزیاتی رسالہ ہے جو قارئین کو پاکستان کے تمام دینی و مذہبی پرچوں کے حصول اور مطالعے سے بڑی حد تک بے نیاز کرتا ہے۔ یہ اپنی طرف سے پرچوں کے مندرجات پر بالعموم کوئی تبصرہ نہیں کرتا 'مگر کبھی کبھار مثبت سمت میں چند اشارے کر دیتا ہے ' مثلاً شمارہ نومبر میں ' دینی جماعتوں اور گروہوں کی روش کے حوالے سے مدیر نے لکھا ہے: "اپنی اپنی ڈفلی اور اپنا اپنا راگ ' اور مطالبہ ہے ملک میں اسلامی نظام کے نفاذ کا۔ خواہش ہے کشمیر کی آزادی کی ' اور عزم ہے کہ نیو ورلڈ آرڈر ان سے پناہ مانگے اور امریکا ان سے تھر تھر کانپے"۔ اداریوں اور مضامین کے بعض جملے اور پیرے ' واوین میں دیے جاتے ہیں 'جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے بعض دینی رسالے ' تہذیب و شرافت کے ایک معیار سے گری ہوئی زبان بھی استعمال کر جاتے ہیں ' مثلاً محمد بن عبدالوہاب کو "گرو گھنٹال" اور شاہ سعود کو "تخریبی ذہن" کا حامل کہنا وغیرہ ' چنانچہ "نقیب ختم نبوت" میں ایسے ہی ایک مضمون کے متعلق مدیر نے بجا طور پر یہ نوٹ درج کیا ہے: "زبان و بیان کے لحاظ سے تیسرے درجے کا طنزیہ اسلوب کسی دینی پرچے کے معیار کے لحاظ سے محل نظر ہے" (دسمبر ' ص ۴۳)۔ جنوری کے شمارے میں مدیر کے قلم سے سال گذشتہ کی دینی صحافت کا ایک سیر حاصل اور بھرپور تجزیہ شامل ہے 'جس میں مختلف رسائل کے رجحانات اور علمی و طباعتی معیار پر رائے زنی کی گئی ہے اور آخر میں بعض نتائج اخذ کیے گئے ہیں۔

کمپیوٹر کی نسبتاً خفی مگر نکھری ہوئی کتابت ' صاف ستھری طباعت ' املا و کتابت کی اکا دکا غلطیاں۔ "وقت نہیں ملتا" کے شکوہ کناں مصروف سیاست کاروں ' صحافیوں ' اساتذہ اور طلبہ وغیرہ کے لیے اپنے موضوع پر یہ منفرد جریدہ ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔

جنوری کے شمارے میں اعلان کیا گیا ہے کہ آیندہ اہم مغربی اور امریکی جرائد کی اسلام اور عالم اسلام کے بارے میں آرا' جائزوں اور تجزیوں کا خلاصہ ' اور مسلم دنیا پر اہم مضامین کا تعارف اور

اشاریہ بھی "دینی صحافت" میں شامل کیا جائے گا۔ قابل ذکر بلکہ قابل داد بات یہ ہے کہ پورا پرچہ مدیر کی انفرادی محنت و کاوش اور لیاقت کا نتیجہ ہے۔ (ر- ہ)

دیوانِ غالب کامل تاریخی ترتیب کے ساتھ: مرتبہ کالی داس رضا گپتا۔ ناشر: انجمن ترقی اردو پاکستان، ڈی ۱۵۹ بلاک ۷ گلشن اقبال کراچی ... ۷۵۳۰۰۔ صفحات ... ۴۰۰۔ قیمت ... ۱۵۰ روپے۔

مرزا اسد اللہ خاں غالب کا اردو مجموعہ کلام "دیوان غالب" اردو کی چند مقبول ترین کتابوں میں سے ہے۔ غالب کی زندگی میں ان کا متذکرہ دیوان ۵ بار شائع ہوا اور ہر بار اس میں کمی بیشی کی جاتی رہی۔ ۱۸۶۲ کے ایڈیشن میں سب سے زیادہ (۱۸۰۲) اشعار ہیں اور یہی نسخہ متداول ہے۔ زیر نظر نسخے میں متداول ۱۸۰۲ شعروں سمیت کل ۴۲۰۹ شعر جمع کیے گئے ہیں۔ اس اعتبار سے یہ غالب کے اردو کلام کا ایسا کلیات ہے جس میں ان کا آج تک دریافت شدہ پورا اردو شعری کلام تاریخی ترتیب سے درج ہے یعنی سب سے پہلے وہ اشعار لیے گئے ہیں جو سب سے پہلے تخلیق ہوئے، اس کے بعد تخلیقات مابعد۔ اس تاریخی ترتیب سے یہ پتا چلا کہ غالب کا یہ شعر تاریخی اعتبار سے بھی ان کی زندگی کا آخری شعر ہے۔

دم واپسیں بر سرِ راہ ہے عزیزو! اب اللہ ہی اللہ ہے

کالی داس رضا گپتا اردو کے معروف محقق اور غالب شناس ہیں۔ زیر نظر کلیات کی ترتیب میں انھوں نے درجہ اوّل کے ۱۹ ماخذوں کی مدد سے کلام غالب کے گیارہ دَور قائم کر کے ہر دَور میں کہے گئے اشعار کی تعداد بھی متعین کی ہے اور ایک جدول کی مدد سے دکھایا ہے کہ ہر دَور کے کل اشعار سے کتنے شعر متداول دیوان کے لیے انتخاب کیے گئے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ۱۸۵۷ کے بعد کے ۲۰۷ اشعار سے متداول دیوان میں صرف ۶ شعر شامل ہیں۔ ابتدا میں ۸۷ صفحات کے سیر حاصل مقدمے میں، مولف نے زیر نظر کتاب کے متعدد پہلوؤں پر تحقیقی بحث کی ہے۔ اس کے آخر میں "توقیت غالب" شامل ہے تاکہ اشعار کے زمانۂ فکر کے ساتھ اگر کوئی صاحب، غالب کی اس عہد کی نجی سرگرمیوں کا بھی موازنہ کرنا چاہیں تو انھیں کوئی دقت نہ ہو۔ آخر میں چند مفید اشاریے بھی شامل ہیں۔

اپنے موضوع پر یہ ایک قابلِ قدر تحقیقی کاوش ہے، جو مرتب کی غیر معمولی محنت اور علمی لگن کا نمونہ ہے۔ اردو زبان و ادب کے لیے یہ ایک نیک فال ہے کہ یہ کام گپتا صاحب کے ہاتھوں انجام پایا ہے۔ (ر- ہ)

ترجمان القرآن

حاصل کرنے کے لئے

درج ذیل بک اسٹالوں اور ایجنٹس سے رابطہ کیجیے

پنجاب

۱۔ مکتبہ افکار اسلامی بازار شاہ فیصل، راولپنڈی۔
۲۔ دارالکتب گارڈن کالج روڈ، راولپنڈی۔
۳۔ مکتبہ افکار اسلامی عمر مارکیٹ، کچہری بازار، فیصل آباد
۴۔ ادارہ تبلیغ الاسلام جلالپور جٹاں، ضلع گجرات۔
۵۔ زاہد اسٹیشنرز غازی بازار کھاریاں کینٹ
۶۔ پنیالہ کتاب گھر مظفرگڑھ
۷۔ اسلامی نیوز ایجنسی شاہین مارکیٹ، وہاڑی
۸۔ ایمیزان اسٹور مین بازار فورٹ عباس، ضلع بہاولنگر۔
۹۔ محمود نیوز ایجنسی ملہال مغلاں، ضلع چکوال۔

سندھ

۱۔ مکتبہ تحریک اسلامی احمد مارکیٹ، لطیف آباد نمبر ۸، حیدر آباد۔
۲۔ مکتبہ تعمیر انسانیت نزد کرن بیکری، سکھر۔
۳۔ مکتبہ تعمیر انسانیت ڈہرکی، ضلع سکھر۔
۴۔ مکتبہ مشعل راہ شکار پور
۵۔ مکتبہ ادارہ اسلامی منصورہ، حیدر آباد۔

سرحد

۱۔ افضل نیوز ایجنسی چوک یادگار، پشاور۔
۲۔ ریاض نیوز ایجنسی ایبٹ آباد۔
۳۔ حجازی بک سنٹر چوک فوارہ، اٹک شہر۔

آزاد کشمیر

۱۔ بدل نیوز ایجنسی، چوک شہیداں، میرپور۔
۲۔ جدید بک ڈپو شہید چوک، کوٹلی۔
۳۔ اسلامک نیوز ایجنسی ڈڈیال، ضلع میرپور۔

دیگر تمام چھوٹے بڑے شہروں میں بک اسٹال اور نیوز پیپر ایجنٹس، ایجنسی حاصل کرنے کے لئے رابطہ کریں۔

منیجر ترجمان القرآن، ۵۔اے ذیلدار پارک اچھرہ، لاہور 54000 فون :- 7587916

REGD. NO. L 5340

PHONES : 7587916
7585590

MONTHLY **TARJUMAN-UL-QURAN** LAHORE